Mohd Rather

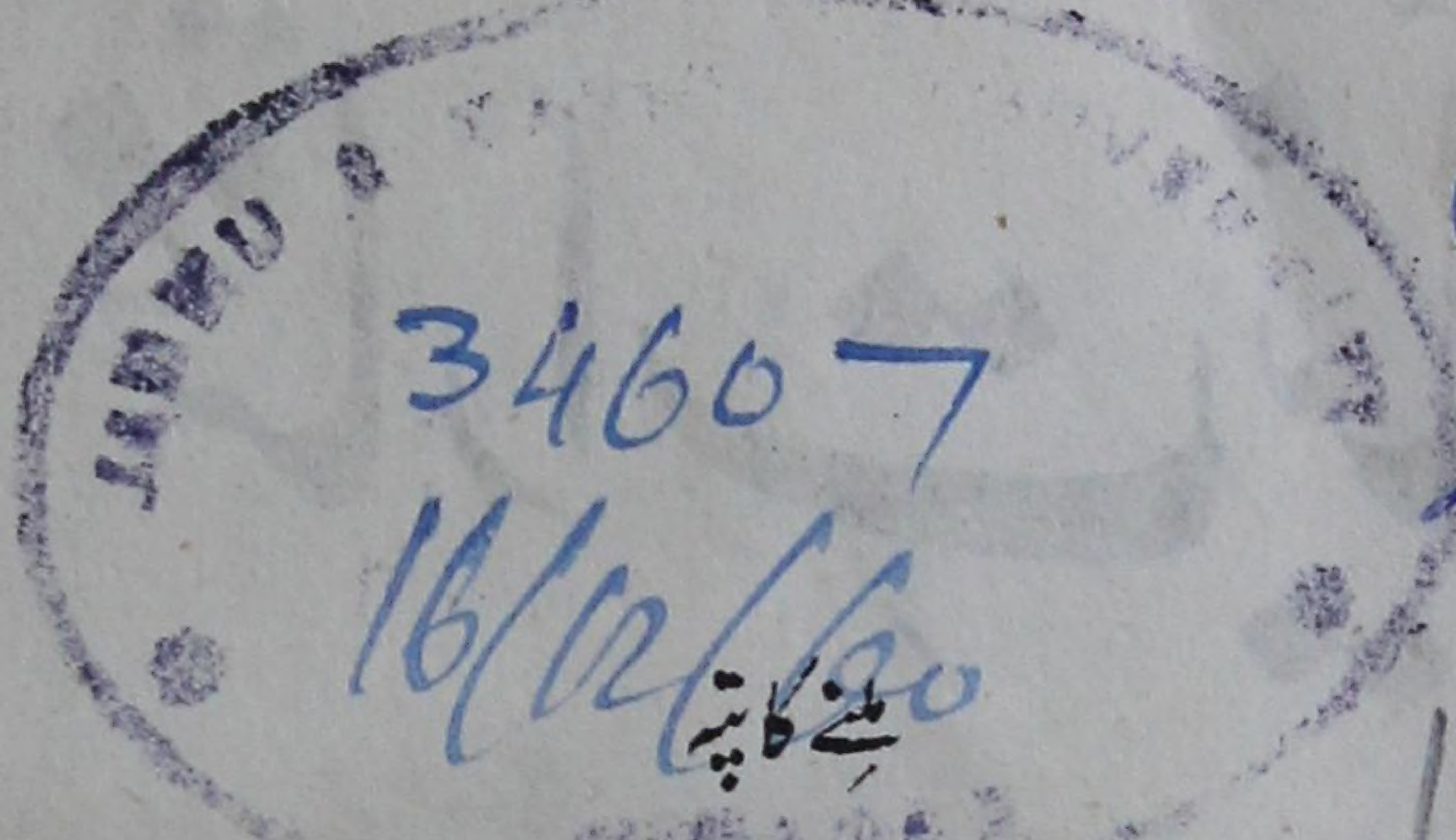


# مختاراتِ نیاؔز

(افسانے)

نیاز فتحپوری

ادارہ فروغِ اردو لاہور




ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغِ اردو - لاہور

کوہِ نور بک ڈپو - لاہور

(اپریل ۱۹۴۷ء)

باراول قیمت ۸/ روپے




عنایت حسین مالک کوہ نور بک ڈپو نے پی - آر - بی - الیس پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

# فہرس

## سنہ ۳۱۰۵ء

زمانہ بھی گویا مکان ہی کی ایک قسم ہے بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں :-
"فلاں واقعہ کو ایک ہزار سال کا زمانہ ہوگیا" یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں واقعہ آفتاب کے گرد زمین کی گردش کے وقت فلاں فضا میں ظاہر ہوا۔ اگر آفتاب و زمین کی گردشوں کی تعیین مکان فضائی کے لحاظ سے ممکن ہو تو اس طرح بھی ہم وہی سمجھ سکتے ہیں جو وہ کہہ کر سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایسا کہنا فہم و ادراک کیلئے زیادہ واضح روشن ہوگا۔"

میں ان الفاظ کو اس طرح ادا کر رہا تھا کہ سن سکوں۔ کیونکہ میری عادت ہے کہ جب کسی دقیق امر کو اپنے لئے قابلِ فہم بناؤں تو اپنے خیال کو الفاظ کی

صورت میں زبان سے بھی ادا کروں۔ الغرض میں زمان و مکان کے اِسی فرق پر غور کر رہا تھا کہ غنودگی طاری ہوئی جو نیند میں تبدیل معلوم ہوتی تھی۔ دفعتہً ظاہری حواس میں کچھ تعطل محسوس کرنے لگا۔ غفلت و بیداری کے درمیان ایک خاص کیفیت پیدا ہوئی اور پھر...... اگر نیند بھی تھی تو صرف جسم ظاہر کی کیونکہ میرا دماغ اور اعصابِ باطن اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ خیالات آتے تھے اور منتشر ہوتے تھے۔ قیاس و تصوّر کا مرکز قائم ہوتا تھا اور مٹ مٹ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زمان و مکان کا شعور محو ہو گیا اور مَیں ایسا محسوس کرنے لگا کہ آہستہ آہستہ گم ہوتا جا رہا ہُوں۔ جیسے رفتہ رفتہ تاریکی گھٹ کر روشنی بڑھتی جاتی ہے......

صبح ہوئی اور مَیں ہوا میں اس قدر بیتاب ہو کر سانس لینے لگا۔ گویا برسوں سے صاف ہوا مجھ کو ملی ہی نہ تھی، بستر سے اُٹھا کیونکہ مجھے دیر ہو گئی تھی۔ لیکن جب مَیں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو پھر وہیں بیٹھ گیا کیونکہ یہ کمرہ نہ میرا کمرہ تھا اور یہ بستر نہ میرا بستر۔ دیوار پر نگاہ گئی تو میں حیرت سے دم بخود ہو گیا کیونکہ جو کلنڈر وہاں لٹکا ہوا تھا اُس میں یہ تاریخ نظر آئی۔ ۷، فروری ۳۱۰۵ء سنہ ۳۱۰۵ء !!

اب جو میں نے غور سے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ فرش، تکیہ، بستر اور لحاف سب ہوا سے بھرے ہوئے ربڑ کے ہیں اور کمرہ حد درجہ صاف پاکیزہ ہے۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ یقیناً میں بیمار ہو گیا تھا اور یہ شاید یہودیوں کا شفاخانہ ہے۔ کیونکہ کلنڈر سے جس سن کا پتہ چلتا ہے وہ غالباً یہودی سن ہے جو موسیٰ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جو مسیح سے تقریباً ۱۳۰۰ سال قبل پائے جاتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ یہودی بھی کس درجہ مذہب پرست ہیں کہ اپنا سنہ بھی انھوں نے وہی قائم رکھا۔ پھر خیال آیا کہ مجھے شفاخانہ لانے کا کیا سبب ہو سکتا تھا۔ میں بیمار تو پڑا نہ تھا۔ پھر میں نے اپنے جسم کو جا بجا ٹٹولا کہ شاید کوئی علامت زخم یا ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کی نظر آ جائے۔ لیکن یہ بھی نظر نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے حافظہ پر زور دیا کہ شاید کوئی حادثہ یاد آ جائے۔ لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار میں بستر سے اُٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا۔ لیکن دو قدم بھی نہ چلا ہوں گا کہ میرے کانوں میں زور سے ایک آواز آئی۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک جوان عورت نظر آئی جو زور زور سے کہہ رہی تھی کہ "اہاہا نیند کا بیمار اچھا ہو گیا۔ نیند کا بیمار اچھا ہو گیا!

چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ شفاخانہ کے گوشہ گوشہ سے یہی آواز آنے لگی اور پندرہ منٹ کے اندر ساری سڑک پر یہی شور تھا۔ میں ہمت کر کے دریچہ کی طرف گیا اور جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ عجیب و غریب ہیئت کے لوگ پھر رہے ہیں اور یہی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ "نیند کا بیمار اچھا ہو گیا۔ دیکھو وُہ کھڑکی سے جھانک رہا ہے مگر ابھی وُہ بہت ضعیف ہے۔ اس کو پھر لیٹ جانا چاہیئے۔ کہاں ہیں ڈاکٹر و تیماردار؟"

لوگ اپنے بچّوں کو کندھوں پر اُٹھا اُٹھا کر مجھے دکھا رہے تھے اور اتنی ہی دیر میں میری کھڑکی کے پاس سے کم از کم پچاس چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز گزرے جس کے اندر سے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں اسی منظر میں مشغول تھا کہ پشت پر آ کر کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ ایک دُبلا پتلا لانبے چہرہ کا آدمی تھا لیکن سر بہت بڑا تھا۔ خدوخال سے کچھ نسائیت ٹپکتی تھی اُس نے نہایت شیریں آواز سے کہا "ابھی تم بہت ضعیف ہو، بستر پر لیٹ جاؤ۔"

اس کی آواز میں ایسی نرمی و شیرینی تھی کہ اُس کا کہنا ماننے پر مجبور رہو گیا اور بستر پر جا کر لیٹ رہا۔ یہ میرے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میری

نبض و زبان دیکھ کر بولا کہ "میرے نزدیک تو اب تمہیں آرام ہو گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ڈاکٹروں کی مجلس تمہیں دیکھ کر فیصلہ کرے۔"

میں نے کہا "میں کیا بیمار تھا اور مجھے گھر جانے کی اجازت کب ملیگی؟"

وہ یہ سن کر ایک طویل ہنسی کے ساتھ ہنسا جو قہقہہ سے کم تھی اور بولا:-

معلوم ہوتا ہے تم ابھی تک بالکل ناواقف ہو کہ تم پر ۱۱۸۰ سال بیماری کے گزر چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں تمہارے دماغ پر فالج گرا اور تم بیہوش ہو گئے۔ لیکن تمہارے اور اعضا جسم برابر کام کرتے رہے۔ ہم لوگ غفلت ہی کے عالم میں تم کو غذا دیتے تھے۔ تمہارا علاج کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تم اب بالکل اچھے ہو گئے ہو۔ قصّہ مختصر یہ کہ تم ۱۱۸۰ برس تک سوتے رہے اور اب جاکر بیدار ہوتے ہو۔"

اس کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن اس سے جھگڑنا بھی بیکار تھا۔ اس لئے میں نے یہ سننے کے بعد بھی ایک عزم و ثبات کے ساتھ یہ کہا کہ "میں اپنے اہل و عیال کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ یہ سن کر ہنسا اور اس مرتبہ اس کی ہنسی میں کچھ تحقیر بھی شامل تھی۔ مجھے غصّہ آگیا اور بولا کہ "اگر میں اپنے اہل و عیال کے پاس نہ پہنچا تو اس کھڑکی سے گر کر جان دیتا ہوں اور تم اس کے ذمہ دار ہوگے۔

یہ سُن کر اُس کے چہرہ پر اضطراب کی سُرخی نمودار ہوئی اور نہایت تسکین کے لہجہ میں بولا۔ بہت جلد تم کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائیگی۔ کوئی اندیشہ نہ کرو۔ ہم سب تمہاری راحت و عافیت کے طالب ہیں، دیکھو مجلس کے بعض ممبر وہ آرہے ہیں"۔

مَیں نے دروازہ کی طرف دیکھا تو پانچ یا چھ آدمی میرے کمرے کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ جب یہ اندر داخل ہوئے اور میں نے غور سے اُن کا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن میں سے دو عورتیں تھیں۔ اُن سب نے میری صحت کی جانچ کی اور اجازت دے دی کہ کھانے کے بعد میں باہر جا سکتا ہوں۔ اس کے بعد میرے سامنے ایک طباق لایا گیا جس میں مختلف پھل رکھے ہوئے تھے اور جن کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ غلّہ کی قسم کی پکی ہوئی کوئی چیز میرے سامنے نہ لائی گئی۔ مَیں نے کہا "ان پھلوں سے کیا ہوتا ہے تم تو مہربانی کر کے گوشت روٹی لاؤ۔ بھوک بہت لگی ہے"۔

اُن میں سے ایک نے کہا۔ کہ "جسم کی غذا انہی پھلوں سے حاصل ہوگی اور انہی میں تمہیں مختلف قسم کے میٹھے اور نمکین کھانوں کا مزہ حاصل ہوگا"۔ اور واقعی ان پھلوں میں مَیں نے عجیب و غریب مزے پائے اور طبیعت خوب سیر ہوگئی۔

اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ اور پہلا شخص رہ گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کیا اب تم شہر جانا چاہتے ہو" میں نے جواب دیا "ہاں جانا چاہتا ہوں"۔ اُس نے کوٹ پتلون لاکر دیا اور پہن کر میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔

جس وقت میں باہر آیا تو ایک مخلوق مجھے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ یہ سب کے سب لانبے قد کے دُبلے پتلے لوگ تھے۔ لیکن سر سب کے بہت بڑے۔ مرد عورت میں سوائے اس کے کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا کہ مرد کے لبوں پر نہایت ہلکا سا نشان مونچھوں کا نظر آتا تھا۔ داڑھی ندارد تھی اور تھی بھی تو اس طرح کہ رخسار یا ٹھوڑی پر کہیں دو تین بال نظر آتے تھے۔ اُن کے دہانے بہت چھوٹے تھے۔ نیچے کے جبڑے میں دانت بالکل غائب تھے اور اُوپر کے دانت بھی نہایت چھوٹے چھوٹے تھے۔ میرے ہمراہی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں منجملہ اُن کے ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ اتنے عرصہ تک میں نے کس طرح نباتات کی سی زندگی بسر کی اور یہ کہ معیشت کی اسی صُورت نے مجھے اتنا طویل العمر بنا دیا کیونکہ میری حالت گویا درخت کی سی تھی جس کو حیات کے لئے بہت کم جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ اُس شخص کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میں بڑا امیر ہوگیا ہوں کیونکہ ۱۹۲۵ء میں جب میں بیمار ہوا ہوں ۵۰ ایکڑ زمین میری ملکیت میں تھی لیکن مجھ پر صرف دس ایکڑ کی آمدنی صرف ہوتی رہی اور باقی میرے نام سے

جمع کی گئی میری اولاد کو بھی یہ ورثہ نہ ملا کیونکہ وہ حکومت پر میری موت کو ثابت نہ کر سکے۔ اس کے بعد اُس نے ملک کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار سال کی بتائی کیونکہ اوّل اوّل اشتراکی اضطرابات پیدا ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ کس طرح موجودہ نظام قائم ہوا۔ اُس نے مجھ کو سنیما کے وُہ تمام فلم دکھائے جن میں گزشتہ تاریخ ملک کی محفوظ تھی اور اس طرح میں سمجھنے کے قابل ہو گیا کہ صدی بعد صدی کس طرح مُلک میں انقلابات پیدا ہُوئے یہاں تک کہ وہ عہدِ حاضر تک پہنچا۔ اب میرے ذہن میں آیا کہ جو کچھ اُس نے میری بیماری کے بابت کہا تھا صحیح ہوگا۔ کیونکہ میں اپنی گزشتہ زندگی میں بھی نظریۂ ارتقاء کا قائل تھا اور یقیناً اتنے عرصہ میں دنیا کو ترقی کر کے اس مرتبہ پر پہنچنا چاہئے تھا لیکن میں خود اپنی نظروں میں ذلیل معلوم ہوتا تھا اور ان لوگوں سے ۱۲۰۰ سال پیچھے تھا۔ گویا میں اس وقت کے لحاظ سے ایک متحجر (FOSSILE) انسان تھا اور یہ لوگ مجھے اس طرح دیکھتے تھے جس طرح دیگر آثارِ قدیمہ کو۔ یہ لوگ مجھے گھنٹوں دیکھا کرتے۔ میرے چہرہ اور دماغ پر غور کیا کرتے۔ بچّے کبھی کبھی میری داڑھی کو چھُوتے اور سخت بالوں پر تعجّب کرتے۔ کبھی میرے چھوٹے سر کو دیکھتے اور ہنستے۔

شام کو میں پھر اپنے کمرے میں لوٹ کر آیا اور میری تیمار دار خاتون میوے

لائی۔ کھانے کے بعد وہ مجھ سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ میں اپنے اور اس
کے درمیان ایک خاص تعلق محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ تئیس سال سے یہ میری تیمارداری
کر رہی تھی۔ اُس نے میرے مرض کا حال بیان کیا جو زیادہ طویل نہ تھا۔ اُس نے
بیان کیا کہ میری حالت ایک محوِ خواب انسان کی سی تھی لیکن خون کا ہلکا سا دور
جسم میں ضرور باقی تھا۔ جب ڈاکٹروں نے دیکھا کہ بغیر غذا کے میں مر جاؤنگا۔
تو انہوں نے پچکاریوں کے ذریعہ سے ہفتے میں ایک مرتبہ کیمیاوی غذا پہنچانی
شروع کی۔ یہ عمل برابر جاری رہا۔ میری حیات کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں اور
ایک عجیب و غریب انسان کی حیثیت سے میرا معائنہ کیا جانے لگا۔ میری ترکیب
کے متعلق ڈاکٹروں کو حیرت تھی کیونکہ مجھ میں بعض ایسے غدود پائے جاتے
تھے جو ان لوگوں میں باقی نہ رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ میرے مرنے کے بعد
وُہ مجھ پر عمل جراحی کرینگے لیکن میرے بیدار ہو جانے سے اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔

میری تیماردار عورت نہایت شیریں کلام تھی۔ اُس کا قد بہت لانبا اور
سر بڑا تھا۔ لیکن سینہ اُن نشانات سے بالکل عاری تھا جو کسی وقت عورتوں
میں پائے جاتے تھے۔ لباس اس کا بہت ڈھیلا اور ربڑ کی قسم کے کپڑے
کا تھا۔ سر کے بال کھُلے ہوئے تھے جو اُڑ اُڑ کر گردن و چہرہ پر آ جاتے تھے۔

پنڈلیاں، بانہیں، سر بالکل عُریاں تھے اور پاؤں میں موزے بھی نہ تھے۔

میں خیال کرتا تھا کہ اس خاتون کو مجھ سے اُلفت ہے اور مجھے وہ دُوسرے لوگوں کی طرح حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ میرا ارتباط اس سے بڑھتا جاتا تھا اور وُہ بھی نہایت خلوص سے حالات بیان کیا کرتی تھی۔ اُس نے لوگوں کی غذا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ پکانا نہیں جانتے اور نہ جانور ذبح کرتے ہیں بلکہ پھل اس قسم کے پیدا کرتے ہیں کہ اُن سے دوا و غذا دونوں کا کام لیا جا سکے۔ شکر وغیرہ جمادات سے پیدا کرتے ہیں اور زراعت اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو بڑے ماہر ہیں اور جو اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں نئے نئے تخم پیدا کرتے رہتے ہیں اور مختلف غذاؤں کی کیفیات ایک ہی پھل میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں پھلوں کے پیدا کرنے میں اس بات کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ رنگ و بُو کے لحاظ سے وُہ باصرہ و شامہ کے لئے بھی غذا پہنچانے والے ہوں۔

اس زمانہ کے مکان بھی نہایت عجیب و غریب ہیں بعض تو اتنے بلند اور وسیع ہیں کہ دو دو سو آدمی اُن میں رہتے ہیں لیکن وُہ لوگ جو تنہائی پسند ہیں۔ وُہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور علمی تجربوں میں شب و روز صرف کیا کرتے ہیں۔

تاہم یہ اس تنہائی میں بھی اکیلے نہیں ہیں کیونکہ ٹیلیفون، لاسلکی کے ذریعہ سے جب اور جس سے چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں جس دوست سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت سامنے آجاتی ہے اور اس کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے۔

شہر میں اب کہیں گردوغبار کا نام نہیں ہے کیونکہ سڑکیں بالکل لکڑی یا ربڑ کی ہیں، اسی طرح کھیتوں کے راستے بھی گرد سے صاف ہیں جن کے دونوں طرف بجلی کی روشنی ہے مکان کی صفائی، روشنی سب لاسلکی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص کے پاس ایک موٹر اور ایک ہوائی جہاز ہے جو لاسلکی سے چلتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی زندگی عام طور پر انفرادی حیثیت سے بسر ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وہ اجتماعی ہے کیونکہ لاسلکی کے ذریعہ سے روزانہ دور دراز مقامات کے گانے سننا۔ ڈرامے دیکھنا، اپنے احباب سے خواہ وہ کسی ملک میں ہوں باتیں کرنا اُن کی صورت دیکھنا معمولی باتیں ہیں۔ علاوہ اس کے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے وہ جہاں چاہیں ہوا سے بھی زیادہ جلد پہنچ سکتے ہیں۔

لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ وُہ متاہل زندگی کے مفہوم سے ناآشنا ہیں
مجھے افسوس ہوا جب میں نے دیکھا کہ میری تیماردار خاتون بھی اس جذبہ سے
بالکل ناآشنا تھی حالانکہ میں آرزومند تھا کہ اس کے ساتھ ایک دائمی تعلق
ازدواج کا پیدا کروں۔ بچے ہوں اور ہم متاہل زندگی کا لُطف حاصل کریں
اس لحاظ سے یہ لوگ بالکل جامد ہیں۔ رات دن عقل و دماغ سے کام لیتے لیتے
اُن کے رقیق جذبات بالکل محو ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ نہ کسی خوشی کی بات پر ہنسنا
جانتے ہیں اور نہ رنج کی بات پر غصّہ یا افسوس کا اظہار کرنا۔

ازدواج کا طریقہ اُن کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن بربنائے عشق و
محبّت نہیں بلکہ معیشت و نسل کی حیثیت سے، جب کوئی مرد کسی عورت سے
مشاغل علمی کے سلسلہ میں ملتا رہتا ہے اور علمی ذوق کے لحاظ سے دونوں میں
ہم آہنگی ہوتی ہے تو وُہ ایک ہی جگہ رہنے لگتے ہیں لیکن سلسلہ تناسل کی اجازت
ان کو نہیں ملتی جب تک حکومت اس امر کا فیصلہ نہ کر دے کہ یہ دونوں اچھی نسل
پیدا کرنے کے اہل ہیں۔

اُن کو یقین ہے کہ انسان پہلے بندر تھا اور اُس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کر
کے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ سنیما کے فلم جو ہزاروں سال کے اُن کے

پاس محفوظ ہیں۔ وہ اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انسان اب سے قبل کیسا بھدّا اور چھوٹے سر کا ہوتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے دماغ نے کیسی ترقّی کی۔ اِس لئے وہ نسل کے مسئلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

جب کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے تو ڈاکٹر جمع ہوتے ہیں اور اس کے جسم کا معائنہ کرتے ہیں۔ اگر وہ ہر لحاظ سے صحیح وسالم ہوتا ہے تو خیر، ورنہ اُسی وقت ہلاک کر ڈالتے ہیں اور ماں باپ بھی کوئی افسوس نہیں کرتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے بچّے جو چھوٹے سر کے پیدا ہوئے تھے، ہزاروں کی تعداد میں ہلاک کر دیئے گئے۔ اس اندیشہ سے کہ موجودہ نسل پھر گزشتہ حالت کی طرف نہ لوٹ جائے۔

تربیّت کا طریقہ ان کے ہاں نہایت اچھّا ہے۔ چھ سال تک بچّہ ماں باپ کے پاس رہتا ہے۔ اس کے بعد مدرسہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کو عملی تعلیم دی جاتی ہے جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات کا درس سنیما کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے اور دس سال کی عمر میں اس کو اس قدر صحیح معلومات حاصل ہو جاتی ہیں کہ قدیم مدارس میں تیس سال کے بعد بھی ممکن نہ تھی۔ مدرسہ عبارت ہے صرف تجربہ گاہ اور کتب خانہ سے۔ طالب علم کو دو

امتحان دینے پڑتے ہیں۔ ایک زراعت، کیمیا، ترکیب آلات وغیرہ کا۔ دوسرا تاریخ عالم اور فلسفہ کا معمولاً چالیس سال کی عمر سے پہلے تعلیم ختم نہیں ہوتی۔ اور یہ مدت زیادہ نہیں ہے کیونکہ ان کی عمر طبعی بھی ڈیڑھ سو سال کی ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں صحراؤں، بڑے بڑے پہاڑوں، قطب، برفستانی علاقوں کی بھی سیاحت کرنی پڑتی ہے اور اس طرح جب کوئی طالب علم مدرسہ سے نکلتا ہے تو وہ ساری دنیا کی سیاحت کئے ہوئے ہوتا ہے۔

معاش کا نظام وہی ہے جو اشتراکیین کسی وقت چاہتے تھے۔ ملک قصبات میں اور قصبات قریوں میں منقسم ہیں۔ ہر قریہ ہزار ایکیڑ کا ہے اور ایک تجربہ گاہ اس کے لئے مخصوص ہے۔ زراعت بہت کم ہوتی ہے اور زمین کا اکثر حصہ بڑے بڑے درختوں سے معمور ہے جن سے غذا، لباس اور ایندھن حاصل کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کا بھی رواج نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ دریا تقریباً خشک ہو گئے ہیں۔ جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اُوپر جاتے ہیں اور خاص قسم کی گیس پیدا کر کے جہاں چاہتے ہیں پانی برسا لیتے ہیں۔ قریوں کے کارخانے ہر چیز کو تیار

کرتے ہیں۔ اس لئے تبادلۂ اشیا کا رواج ملک میں تقریباً مفقود ہے۔ ہر شخص کو حصولِ معاش کیلئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے۔ باقی اوقات تحقیقاتِ علمی میں صرف ہوتے ہیں۔

ملک کی حکومت پانچ مجلسوں میں مرکب ہے :-

(۱) مجلسِ تشریعی (۲) مجلسِ قضائی (۳) مجلسِ صحافی (۴) مجلسِ دینی (۵) مجلسِ تنفیذی۔

مجلسِ تشریعی کے افراد مختلف جماعتوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ مثلاً جماعت اطبا سے دس، علمار حیات کی جماعت سے دس، علمار زراعت کی جماعت سے دس۔ اسی طرح مختلف جماعتوں سے ۵۰۰ ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے مجلسِ قضا کا کام بہت کم ہے کیونکہ جرائم مفقود ہیں تاہم اس مجلس کے ممبر علمار حیات کی جماعت سے منتخب ہوتے ہیں تاکہ وہ فیصلہ کرسکیں کہ کون قتل کا مستوجب ہے اور کون منع تناسل کا۔ کیونکہ صرف یہی دو سزائیں یہاں رائج ہیں۔

مجلسِ صحافت متعدد جماعتوں کی نمائندہ ہے جن میں سے بعض روزانہ لاسلکی اخبار جاری کرنے والی ہوتی ہیں بعض ادبی اور بعض طبی اخبارات کی

اشاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔ تمام اخبارات جماعتوں کے انتظام سے جاری ہوتے ہیں اور انفرادی طور پر کسی کا حق قائم نہیں ہے۔

مجلسِ دینی کے ممبر صرف وُہ فلاسفر ہیں جن کی عمر ۷۰ سے کم نہیں ہے قوم کے ذوق کی تربیّت اسی مجلس سے متعلق ہے اور موسیقی، رقص، تصویر اور تمثیل وغیرہ کا احتساب بھی اسی کے سپُرد ہے۔ معبدوں میں لوگ انفرادی طور پر جاتے ہیں اجتماعی حیثیت سے نہیں۔ معبد عبارت ہے ایک بڑی مستطیل عمارت سے جس کی ایک دیوار پر تصویروں کے ذریعہ سے یہ دکھایا گیا ہے کہ اوّل جاندار کیونکر پیدا ہُوا پھر ترقی کرکے وہ انسان کی حد تک کس طرح پہنچا اور آئندہ کیا توقع کی جاتی ہے۔ آئندہ کے انسان کا سر بہت بڑا، آنکھیں بہت کھُلی ہوئی اور انگلیاں بہت باریک دکھائی گئی ہیں۔ دوسری دیوار میں عہد حجری سے لے کر موجودہ زمانہ تک ارتقاء صنعت تصاویر کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ تیسری دیوار میں کرۂ ارض دکھایا گیا ہے اور اس کے اُوپر ایک انسان کی تصویر بنائی گئی ہے جو اس وسیع فضا میں مرکزِ زمین پر غور کر رہا ہے۔ چوتھی دیوار میں بڑے بڑے فلاسفہ اور انبیاء کی صورتیں ہیں۔ اور ان کے لبوں کے سامنے وُہ فقرے درج ہیں جو تاریخِ عالم میں اپنا

اثر چھوڑ گئے ہیں۔ عبادت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان معبد میں جاکر کائنات پر غور کرے اور اس کے ساتھ اپنے تعلّق کی حیثیت کو سمجھے۔ مجلس تنقیدی کا کام احکام کا نافذ کرنا ہے۔

یہاں ایک شخص کی حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ وُہ چھ سال تک ماں باپ کے پاس رہتا ہے۔ پھر مدرسہ میں چالیس۴۰ سال کی عمر تک تعلیم پاتا ہے اور اس کے بعد کسی کارخانہ میں عملی زندگی شروع کرتا ہے۔ اب اُسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وُہ کسی جماعت کی طرف سے کسی مجلس کا ممبر بن سکے۔ اہلِ مُلک کی کمائی ہر شخص پر اس کی محنت کے لحاظ سے تقسیم کی جاتی ہے سال کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی جو لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ فراغت کی زندگی بسر کریں وُہ زیادہ محنت کرتے ہیں مکان، پانی، روشنی اور حرارت لوگوں کو مفت ملتی ہے، کھانا، لباس نہایت ارزاں ملتا ہے اسی لئے بڑا خرچ موٹر اور ہوائی جہازوں کا ہے جو لاسلکی کے ذریعہ سے چلتے ہیں۔ انہیں کثرتِ نسل کا بھی خیال نہیں ہے وہ چاہتے ہیں کہ جو نسل بڑھے وہ ذکی ہو۔ اس لئے میرے ملک کی آبادی جو ۱۹۲۵ء میں کروڑوں تھی۔ اب صرف چند لاکھ رہ گئی ہے۔ لیکن اُن میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو فلسفہ

وغیرہ علوم سے نا آشنا ہو اور ساری دُنیا کی سیاحت نہ کر چکا ہو۔ کیونکہ اُن کے ہاں قابلِ لحاظ اشخاص کی تعداد نہیں ہے بلکہ اُن کی قابلیّت ہے۔ وُہ مقدار کو نہیں دیکھتے بلکہ کیفیّت و حالت کو دیکھتے ہیں۔

(احلام اغا مسقہ) نگار اگست ۱۹۲۶ء

# فاطمہ

(۱)

قاہرہ کے ایک بڑے اور آباد محلہّ میں ایک مکان ہے، جس پر سکون، خاموشی اور وحشت چھائی ہوتی ہے، اور جو ایک عرصہ سے ویران ہے، محلہّ کے پرانے خیال کے لوگ اس ویرانہ کو جنّات و شیاطین کا مسکن سمجھتے ہیں، اور اس کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور ہیں گویا اس عہد کی روشن خیال آبادی کے محلّہ میں یہ ویرانہ عہد قدیم کی توہم پرستی کا ایک ظلمت کدہ ہے۔ اس اُجڑے ہوئے گھر میں ایک وسیع صحن ہے جہاں صبح کے دھندلکے اور شام کی تاریکی میں چمگادڑیں اِدھر

سے اُدھر اُڑا کرتی ہیں اور ان کی پرواز کی آواز جب قرب وجوار کے مکانوں میں پہنچتی ہے، تو وہاں کے باشندوں کے توہمات میں اور نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک روز شام کے وقت اس ویرانہ کے ہمسایوں نے دیکھا کہ ایک بڈھا اس مکان میں داخل ہؤا، یہ نہایت بدصورت تھا، اس کی کمر جھکی ہوئی تھی، اور لاٹھی ٹیکتا ہؤا آرہا تھا، اس کے ساتھ ایک نہایت بدصورت حبشی تھا۔ جو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے لا رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر بہت متوحش اور خوفزدہ ہوئے اور خیال کیا کہ شاید یہ کوئی ساحر ہے، جو شیاطین کو مسخر کرنے کا عمل جانتا ہے، یہ بڈھا ہفتہ میں صرف جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے ویرانہ سے باہر نکلتا تھا، جب وُہ جمعہ کے دن کھنڈر سے باہر نکلتا تو لوگ حیرت سے اُس کی طرف اشارہ کرتے اور اس کی نسبت قسم قسم کے خیالات قائم کرتے،

اس ویرانہ سے ملا ہؤا ایک شاندار مکان تھا جس میں ایک معزز شخص کی سکونت تھی، صاحبِ خانہ کا نام لطیف پاشا تھا۔ اس کی ایک بیوی نادر اور ایک لڑکی فاطمہ تھی۔ فاطمہ کی عمر انیس سال کی تھی جو اپنے عہدِ طفولیت ہی میں ماں کی آغوشِ شفقت سے محروم ہو چکی تھی۔ پاشا کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی، وہ اپنی زندگی کے مراحل کو لہو ولعب،

اسراف وتنعّم اور کثرتِ ازدواج میں گزار چکا تھا اور اب اپنے شباب کے معاصی کا خمیازہ اُٹھا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک فضول خرچ عورت تھی۔ جو رات دن اپنے شباب کی نمائش، زیور و لباس کی تزئین میں روپیہ اور وقت صرف کیا کرتی تھی اور اس کو مطلق اس کی پروا نہ تھی کہ ایسا کرنے سے اس کا گھر آباد ہوتا ہے یا ویرانی کے غار کی طرف گرا چلا جا رہا ہے۔

فاطمہ میں تمام خصوصیاتِ جمال پائی جاتی تھیں، اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال لمبے، لیکن لوازمِ شباب میں سے صرف شوخ نظری، ذہانت اور ذکاوتِ قلب اس میں باقی رہ گئی تھی۔ کیونکہ حُسن و شباب کی شادابی کا نصف حصّہ تو اسکی ماں کے مر جانے سے ضائع ہو گیا تھا اور باقی نصف حصّہ سوتیلی ماں کے آجانے سے برباد ہو چکا تھا، الغرض وُہ ان نامساعد حالات میں جوان ہوئی تھی اور چونکہ یتیمی ایک ایسا حجاب ہے جو خوبیوں کو بھی بُرائی اور محاسن کو بھی عیوب کی کی صُورت میں پیش کرتا ہے، اس لئے وُہ شروع ہی سے ایک مایوس دل رکھتی تھی اور زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔

اس کا باپ چونکہ بہت مسرف تھا، اس لئے آہستہ آہستہ اس پر قرض کا بار بڑھتا رہا۔ جائداد تلف ہوتی رہی، یہاں تک کہ وہ دن آ

گیا حبس کا آنا ضروری تھا، اور اس کا مکان نیلام ہو گیا۔

دوسرے دن کی صبح کو یہ مکان خالی ہو رہا تھا۔ رہنے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور پاشا غم والم کا نہایت سنگین بار اپنے سینہ پر لیئے ہوئے ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں بڈھے کا حبشی خادم آیا اور ایک گوشہ میں پاشا کو لے جا کر بولا کہ "میرے آقا نے ایک خاص غرض سے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

اس نے پوچھا "تمہارا آقا کون ہے"۔ وہ بولا۔ کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے؟ میں آپ کے نئے پڑوسی مختار آفندی کا خادم ہوں اور مجھے سعید کہتے ہیں"۔

پاشا بولا کہ "مجھ سے ایسے آدمی کو کیا کام ہو سکتا ہے، جو ساری دنیا سے علیحدہ ہو گیا ہے، علاوہ اس کے میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں، اور ایک گھنٹہ میں یہ پڑوس مجھ سے چھوٹ جائیگا۔ میرا دل ایسے لوگوں سے ملنے کو نہیں چاہتا۔

خادم نے کہا کہ "جناب کسی ایسے شخص کے متعلق حکم لگانے میں جلدی نہ کیجئے، جس کو آپ نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں ہے، مجھے اس نے بھیجا ہے تا کہ اس مکان کے متعلق آپ سے گفتگو کروں"۔

پاشا "میں اب اس مکان کا مالک نہیں ہوں اس لئے مجھ سے گفتگو فضول ہے"۔

خادم "میں یہ جانتا ہوں کیونکہ میرے ہی آقا نے اس کو نیلام میں لیا ہے"۔

پاشا "تو شاید تجھے یہ پیغام لے کر بھیجا ہے کہ میں اس مکان کو جلدی خالی کر دوں۔ سو تم اپنے مالک سے جا کر کہو کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں"۔

خادم "نہیں، مجھے تو اس لئے بھیجا ہے کہ میں آپ سے درخواست کر دوں کہ اسی مکان میں قیام رکھیئے اور کہیں تشریف نہ لے جایئے"۔

پاشا نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا اور بولا کہ "میں نہیں سمجھا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے"؟

خادم نے کہا کہ میرا مطلب بالکل واضح ہے، میرا آقا اس مکان کا مالک ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی خواہش یہی ہے کہ آپ بدستور قیام رکھیں، بلکہ وہ آپ کو ۵۰۰۰ گنی بطور ہدیہ کے پیش کرنا چاہتا ہے"۔

پاشا نے کہا "کیا مجھ سے تمسخر کر رہے ہو"؟

خادم نے جواب دیا کہ "ذرا صبر سے کام لیجئے، پوری بات سن لیجئے، میرا

آقا یہ ایثار بلا وجہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ اس کے عوض میں یہ چاہتا ہے کہ آپ اپنی بیٹی فاطمہ کو اس سے منسوب کر دیں"۔

پاشا یہ سُنکر ہنسا اور بولا "تیرا آقا پاگل ہے، مَیں کیونکر اپنی بیٹی کی شادی، ایک اپاہج بدصورت بڈھے سے کر سکتا ہوں۔ مجھے فقر و فاقہ گوارا ہے، لیکن یہ سودا منظور نہیں"۔

خادم نے کہا کہ "مہربانی فرما کر پھر ذرا غور فرما لیجئے"۔

یہ سُن کر پاشا کو غصہ آ گیا اور بولا کہ "اے رُوسیاہ یہاں سے دُور ہو لیکن سعید اپنی جگہ پر قائم رہا۔

پاشا کی بیوی اور لڑکی نے بھی اس آواز کو سُنا اور دوڑتی ہوئی آئیں کہ "یہ کیا بات ہے"؟ پاشا نے سارا قصہ بیان کیا اور اس طرح دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اس کو کچھ سکون ہوا۔ اب تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص اپنی جگہ خاموش تھا اور پاشا غصہ فرو ہونے کے بعد یہ سمجھنے کا اہل ہو گیا تھا کہ اگر وُہ ایک لفظ "اجازت" اپنے منہ سے نکال دے تو پھر اس کو وہی اگلی زندگی لطف مسرت اور عیش و نشاط کی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فاطمہ آگے بڑھی اور اپنے باپ سے بولی کہ "جو کچھ سعید نے کہا ہے اُسے آپ منظور

کر لیجئے۔ مَیں اُس شخص کے ساتھ نکاح کرنے کیلئے راضی ہوں۔ اس بات کو جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے بڑھا ہے رد نہ کر دینا چاہیئے۔ مَیں نہایت مسرّت کے ساتھ اپنی قربانی کے لیے تیاّر ہوں، اگر اس سے میرے خاندان کی عزّت بچ سکتی ہے۔"

پاشا نے سُنا اور غور کرنے کے بعد وُہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں آتا کہ اس تجویز کو منظور کر لیا جائے۔ آخر کار یہ صورت منظور کر لی گئی۔ اور فاطمہ کا نکاح اُس ضعیف آدمی سے ہو گیا۔

(۲)

فاطمہ اپنے شوہر کے مکان میں داخل ہوئی اس حالت سے کہ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کھنڈر کے وحشت ناک افسانے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور اُس کے مالک کی کریہ صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ لیکن چونکہ وُہ شروع ہی سے مصائب برداشت کرنے کی عادی تھی۔ اس لئے وُہ اب بھی حد درجہ صبر و سکون کے ساتھ ان تازہ آلام کے جھیلنے کے لئے تیاّر ہو گئی۔ جب وہ مکان میں داخل ہوئی تو اس کے شوہر مختار آفندی نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اس ویران مکان کے تمام کمرے

اور سارا سامان اس کو دکھانے لے چلا۔ لیکن فاطمہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اُس نے خلافِ توقع اُس مکان کی آرائش دیکھی۔ یہاں نہایت قیمتی فرش بچھا ہُوا تھا۔ جا بجا تخت رکھّے ہوئے تھے۔ برآمدہ کے سامنے گلاب و یاسمین کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے صحن کو معطّر کر رہے تھے۔ ہر طرف سے عود و مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ اور بلور کے قیمتی فانوسوں سے لطیف روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

آخر میں یہ ایک نہایت وسیع کمرہ کے اندر پہنچے جس کے درمیان ایک فوّارہ اپنے موتی بکھیر رہا تھا۔ مختار آفندی نے فاطمہ کو اُسی فوّارہ کے قریب بٹھایا اور اُس کا ہات اپنے ہات میں لے لیا۔ فاطمہ نے محسوس کیا کہ ایک برقی رو اُس کے جسم میں دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ اُس کا نازک ہات کانپنے لگا جس کو اس کے شوہر نے بھی محسوس کیا۔ مختار آفندی نے نہایت نرم اور پُر لطف لہجہ میں کہا۔ "خدا کرے اس نئے مکان میں تم کو وحشت نہ ہو اور اپنے خواہشاتِ قلب یہاں پا سکو۔" اس کی آواز میں لحن تھا۔ اُس کے الفاظ میں شیرینی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی پُر شباب انسان کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ فاطمہ نے یہ محسوس کر کے اپنا سر اُٹھایا جیسے وہ کسی گہرے خواب سے بیدار

ہوئی ہو لیکن اپنے سامنے جب پھر اُسی بدصُورت بڈھے کو دیکھا تو اس کی نگاہیں پھر مایوسانہ لوٹ آئیں۔

مختار آفندی نے پھر ایک شیریں تبسم کے ساتھ نہایت دلکش آواز میں اُس سے خطاب کیا۔ "یقین کرو کہ تم اپنے باپ کے مکان سے منتقل ہو کر ایسی جگہ آئی ہو جہاں لطف و محبّت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تم اپنی راحت و آسائش اور نشاط و مسرّت کے لیے ہر ممکن شئے کو مہیّا کر سکتی ہو کیونکہ تم یہاں کی ملکہ ہو اور تمہاری ہی اجازت اور مرضی سے سارے کام ہوں گے۔"

وُہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور فاطمہ حیران تھی کہ ایک ضعیف انسان کے مُنہ سے ایسے الفاظ کیونکر نکل سکتے ہیں جن سے شباب ہی شباب ٹپکتا ہے۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اس کی پیشانی اور آنکھوں میں اُس نے خاص قسم کی ملاحت و کیفیّت پائی۔ لیکن اس کے بعد ہی جب اُس نے اس کی داڑھی اور بدصورت ناک کو دیکھا تو پھر وہی اضمحلال محسوس کیا۔ لیکن اُسی وقت مختار آفندی نے بھی اُوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھ لیا اور اس طرح نگاہوں کے اختلاط سے فاطمہ کی آنکھیں شرم سے جُھک گئیں۔ آدھی رات ہو گئی تو مختار آفندی

اُس سے رخصت ہو کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

صبح ہوئی اور فاطمہ کی آنکھ اُن چڑیوں کی آواز سے کھُلی جو مکان کے اندر متعدّد زرّیں پنجروں میں بند تھیں۔ وُہ خاموش اُن کے نغموں کا لُطف اٹھا رہی تھی کہ اس کا شوہر آیا اور بولا کہ "ایک ضروری کام سے مجھے سفر کرنا ہے"۔ اس خبر سے فاطمہ کا دل کُڑھا اور اُس نے سوچا کہ "کس قدر عجیب بات ہے کہ شادی کے دوسرے ہی دن یہ شخص سفر کے لئے آمادہ ہو گیا"۔ مختار آفندی نے اس کے چہرہ سے اس اضمحلال کو معلوم کر کے کہا کہ تم پریشان نہ ہو میرا سفر دو مہینے سے زیادہ کا نہیں ہے تمہاری تفریح کے لئے مکان میں بہت سی چیزیں موجود ہیں میری غیبت میں ان سے دل بہلانا۔ میرا ملازم سعید بھی یہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وُہ نہایت سلیقہ مند اور دلچسپ رفیق ثابت ہو گا۔

فاطمہ نے جواب دیا۔ (اور یہ پہلی گفتگو تھی جو اُس نے اپنے شوہر سے کی) کیا یہ باتیں مجھے آپ کی طرف سے بے پروا کر دینگی"۔ اُس نے جواب دیا کہ "یہ صحیح ہے تاہم کچھ نہ کچھ تو تمہارا دل بہلے گا۔ علاوہ اس کے مَیں نے اپنے بھتیجے شکیب کو بھی کہہ دیا ہے کہ وُہ میری غیبت میں یہاں آتا رہے گا

اور اس کے لیے یہ مکان بغیر کسی حجاب کے ہر وقت کھلا رہے گا۔ یقیناً وہ تمہارے لیے باعثِ دلچسپی ہوگا۔ شکیب نہایت اچھے اخلاق و آداب کا نوجوان ہے وُہ ایک ماہر طبیب بھی ہے"۔ یہ کہہ کر مختار آفندی اُس سے رخصت ہوگیا۔

سعید نے اپنی مالکہ کو خوش رکھنے کی بہت کوشش کی۔ وُہ اچھے اچھے قصّے بیان کرتا۔ لطائف و نوادر سُنایا کرتا اور اس میں شک نہیں کہ فاطمہ کا دل بہل گیا۔ چوتھے دن سعید آیا اور بولا کہ شکیب آئے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں"۔ فاطمہ اپنے لہو و سرور میں اس نام کو بھول گئی تھی اور اُسے قطعی خیال نہ رہا تھا کہ اُس کے شوہر نے اس کی بابت کیا کہا تھا۔ اس لیے پہلے تو اس کو تامل ہُوا۔ لیکن جب اُسے یاد آیا تو اُس نے سعید سے کہا کہ "میرا بھی سلام اور شکریہ پہنچا دو"۔

جب سعید چلا گیا تو فاطمہ نے کھڑکی کے پردہ سے اُس شخص کو دیکھنا چاہا جس کی تعریف اُس کے شوہر نے کی تھی۔ شکیب نہایت خوبصورت جوان تھا اور جس وقت فاطمہ اس کی اور اپنے شوہر کی شباہت کا مقابلہ کرتی تھی تو سوائے پیشانی اور آنکھوں کے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ یہاں حُسن ہی حُسن تھا اور وہاں وہی بدنما داڑھی اور موٹی بھدی ناک، فاطمہ

نے یہ دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی سے علیحدہ ہو کر فرش پر
تکیہ کی آڑ سے بیٹھ گئی —— اُس نوجوان کے قیام کیلئے گوشے کے ایک
کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ فاطمہ وقتاً فوقتاً جھروکے سے اس کو دیکھتی
رہتی اور اپنے شوہر کی طرف سے کراہت میں اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ اپنے
نفس کو ملامت کرتی کیونکہ یہ اُس عہدِ شرافت کے خلاف تھا جو اس کی
قسمت اور مختار آفندی کے درمیان ہو چکا تھا۔ لیکن بعض اوقات وہ شکیب
کو دیکھ کر اس خیال پر مجبور ہو جاتی۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے شکیب
کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ اور اس لیے اس نے سعید کو حکم دیا کہ کھڑکی
کو اچھی طرح بند کر دے۔ شکیب کو آئے ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ فاطمہ
اس کے وجود کی طرف سے تجاہل کر رہی ہے اور یہ نہیں چاہتی کہ سعید اس
کا ذکر کرے لیکن چونکہ شکیب اور فاطمہ دونوں جوان تھے اور شباب کے
برقپارے ایسے نہیں ہوتے کہ اُن کے درمیان دیوار یا پردہ حائل ہو سکے۔
اس لیے جب وہ رات کے سکون میں اُس کی آواز سُن لیتی تھی یا اُس کے
گانے کی آواز کان میں پڑ جاتی تھی تو اس کے دل و دماغ میں پھر تلاطم پیدا
ہو جاتا تھا لیکن چونکہ وہ شکیب اور اپنے شوہر کی آواز میں بہت کچھ مماثلت

پاتی تھی اس لئے پھر کوئی نہ کوئی تاویل کرکے وہ ضبط سے کام لیتی اور اپنے جذبات کو مغلوب کرلیتی۔ کھڑکی بدستور بند رہی اور شکیب اسی طرح تنہا زندگی بسر کرتا رہا۔

اس کے بعد تین دن ایسے گذرے کہ فاطمہ نے شکیب کے گانے کی آواز نہیں سُنی جس سے اُس کو تھوڑا سا انقباض پیدا ہوا۔ اُس نے چاہا کہ سعید سے سوال کرے لیکن باز رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس نے ہمّت کی اور سعید سے اُس کا سبب دریافت کیا اُس نے کہا کہ "شکیب تین دن سے بیمار ہے اور صاحبِ فراش ہے"

فاطمہ نے کہا کہ "تم نے مجھے پہلے ہی دن کیوں خبر نہیں کی"۔ سعید نے جواب دیا کہ "آپ کی بے پروائی اور تغافل نے مجھے اجازت نہیں دی میرے آقا نے آپ سے کہا تھا کہ شکیب کی مدارات کیجئے گا لیکن آپ نے اُس طرف توجہ نہیں کی"۔ فاطمہ یہ سُن کر خاموش ہوگئی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سعید پھر بولا کہ "میرے نزدیک یہ مناسب ہے کہ آپ خود چل کر مزاج پُرسی کریں اور تسلّی دیں"۔ یہ سُن کر فاطمہ نے اپنی چادر اُٹھائی اور اوڑھ کر مریض کے کمرہ کی طرف چلی جس وقت وہ وہاں پہنچی اور نگاہ سے نگاہ ملی تو اُس کو ایسا محسوس

ہونے لگا کہ دل سینے سے باہر نکل پڑے گا فاطمہ نے اپنا ہات دل پر رکھا اور مضطربانہ و منفعلانہ انداز سے داخل ہوئی۔ شکیب سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہات پکڑ کر قریب ہی ایک کُرسی پر بٹھا دیا اور اس عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سعید نے سکوت توڑنے کے خیال سے شکیب کو مخاطب کر کے کہا۔ "آپ کی بیماری کا علم انہیں آج ہی ہُوا ہے اور میں مورد الزام ہُوں کہ مَیں نے اطلاع نہیں دی تھی لیکن جب آج اُنہوں نے خود سوال کیا تو مَیں نے آپ کی بیماری کا حال بیان کر دیا۔"

یہ کہہ کر سعید کمرے سے باہر چلا گیا۔

شکیب بولا "آپ کے آنے سے مجھے بہت سکون ہُوا اور مَیں دیکھتا ہُوں کہ آپ کا آنا اور مرض کا جانا ساتھ ہی ساتھ ہُوا ہے۔"

فاطمہ نے اس حال میں کہ اس کی زبان لڑکھڑائی جاتی تھی کہا "آپ کو کیا شکایت ہے؟"

شکیب۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

فاطمہ۔ "تعجّب ہے کہ آپ طبیب ہیں اور ایسا کہہ رہے ہیں۔"

شکیب۔ "جی ہاں میرا مرض وہ نہیں جسے طبیب پہچان سکیں۔"

فاطمہ۔ "تاہم کچھ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے"۔

شکیب۔ "مجھے تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ اس مکان میں داخل ہوتے ہی قلب میں اضطراب اور جسم میں کپکپی پیدا ہوگئی تھی"۔

فاطمہ۔ "میں جب اس مکان میں آئی تھی تو میرا بھی یہی حال ہوا تھا لیکن میرے لیئے تو یہ امر حیرتناک نہ تھا مگر آپ تو ......"

شکیب "میں تو یہاں نہایت مطمئن قلب کے ساتھ آیا تھا لیکن بدقسمتی کہ اس دریچہ کی طرف نگاہ اٹھ گئی اور نگاہ اٹھتے ہی وہاں سے ایک تیر چلا جو میرے قلب میں پیوست ہوگیا"۔ یہ کہہ کر شکیب نے اپنا منہ رومال سے چھپا لیا اور رونے لگا۔ یہ سن کر فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھا گئی۔ سارا جسم کانپ اٹھا اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا آسمان و زمین پر لرزہ طاری ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ اس تلمیح سے شکیب کا کیا مدعا ہے اور اس نے چاہا کہ اس آگ کے مشتعل ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلی جائے۔ چنانچہ وہ گھبرا کر اپنے ملبوس کو سمیٹتی ہوئی اس طرح اٹھی گویا آگ بالکل قریب ہے اور اس کے دامن کو لے لینا چاہتی ہے۔

رات آئی اور فاطمہ شب بھر کرب میں مبتلا رہی عقل کہہ رہی تھی کہ اپنے

بوڑھے شوہر کے ساتھ نبھانا چاہئے اور نفس کا تقاضا تھا کہ شکیب کی آغوش میں سونپ دینا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ فاطمہ کا قلب اب چُور چُور ہو چکا تھا سب سے پہلے ماں کی موت نے اُسے مجروح کیا۔ پھر سوتیلی ماں کے طعن و تشنیع نے اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اس کے بعد شادی کے واقعہ نے خوب پامال کیا۔ اب یہ آخری تیر شکیب کا تھا جس نے اس کی اذیت کو تکمیل کی حد تک پہنچا دیا۔ الغرض وُہ رات بھر تڑپتی رہی اور ایک لمحہ کیلئے نہیں سوئی۔

صبح ہوئی تو سعید روتا ہوا آیا اور بولا کہ شکیب کو چل کر دیکھ لیجئے اُن کی حالت بہت نازک ہے اور وقت آخر آ گیا ہے وُہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ہذیان میں آپ ہی کا نام لے لے کر پکار رہے ہیں"۔

فاطمہ یہ سُن کر پھر شکیب کے کمرہ میں گئی اور جب سعید چلا گیا تو شکیب نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔ کہ "اے فاطمہ میرا وقت اخیر ہے۔ اب تو آغوش میں آجاؤ کہ دُنیا کو آسانی کے ساتھ چھوڑ سکوں"۔

یہ سُنکر فاطمہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پیچھے ہٹ کر بولی "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہارے چچا کی بیوی ہوں اور اُس نے مجھ سے تمہارے اخلاق

کی بہت تعریف کی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم یہاں ایک بھائی کی طرح آؤ گے نہ کہ ایک بے صبر عاشق کی مانند!"

شکیب "میرا چچا تو گنہگار ہے کہ اُس نے اپنے اُوپر تمہارے شباب کی قربانی کو منظور کر لیا اور مال کی قوت سے تم کو مجبور کیا کہ اپنا دل توڑ کر ساری زندگی کو تباہ کر لو۔ یقیناً تمہیں اُس کی محبت میں کوئی لُطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ رہا چچا بھتیجے کا رشتہ۔ سو تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ محبت ان قیود سے بالکل آزاد ہے۔ اور وُہ اس سے زیادہ نازک و قریب کے رشتے توڑ کر اپنا رشتہ قائم کرتی ہے۔"

فاطمہ "یہ غلط ہے تمہارے چچا پر کوئی الزام نہیں عائد ہو سکتا۔ اُس نے ایسے وقت میں میری مدد کی کہ کوئی دوسرا امداد نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے میرے خاندان کو تباہی سے بچایا اور اتنا زبردست ایثار کیا صرف اس معاوضہ میں کہ میں اُس کی ہو جاؤں۔ رہا عیش و نشاط، سو میں شروع ہی سے اس کی محرومی کی عادی ہوں۔ مجھ سے تم کوئی توقع قائم نہ کرو کیونکہ میں خائن نہیں ہوں"۔

شکیب "میں طبیب ہوں اور میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ تمہارا

شوہر ذیابیطس میں مبتلا ہے اور بہت جلد مر جائیگا۔"

فاطمہ:۔"تو پھر اس سے زیادہ سعادت میرے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ ساراوقت اسی کی خدمت میں بسر کر دوں"۔

شکیب:۔"اچھا تو یہی وعدہ کر لو کہ اگر وہ مر گیا تو تم میرے ساتھ شادی کر لوگی"۔

فاطمہ:۔"میں یہ وعدہ بھی نہ کرونگی کیونکہ اس کی زندگی میں ایسا وعدہ بھی میرے نزدیک خیانت ہے"۔

شکیب:۔"یاد رکھو کہ میں مر جاؤنگا اور یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا"۔

فاطمہ:۔"اگر تم مر گئے (حالانکہ میں جانتی ہوں کہ تم نہیں مروگے) تو میں تمہارے شباب پر بھی اسی طرح آنسو بہاؤنگی جس طرح اپنی جوانی پر بہا رہی ہوں اور تمہارے موت کے واقعہ کو برداشت کرونگی کیونکہ یہ بار خیانت و کفران نعمت کے بار سے ہلکا ہے"۔

شکیب:۔"بہتر ہے تو میں اس مکان سے جاتا ہوں اور اب تم میری خبر کبھی نہ سنوگی"۔

فاطمہ:۔"فی امان اللہ"۔

(۳)

شکیب، اپنے چچا کے مکان سے رخصت ہو گیا اور وُہ وقت بھی ختم ہو گیا جب مختار آفندی نے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔ ایک دن شام کو جب شہر میں اس انقلاب کی خبرِ عام ہوئی جو ترکی کے حزبِ اتحادؔ و ترقی کے ہاتھوں ظہور میں آیا تھا تو سعید خوشی سے چیخنے لگا۔ فاطمہ نے بھی سُنا لیکن اُس کو سبب نہ معلوم ہوُا کہ یہ کیوں اس قدر مسرور رہے۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ اُس کا شوہر داخل ہوُا۔ اور سعید اور وُہ دونوں ایک دوسرے سے انتہائے مسرت کی حالت میں .......... لپٹ گئے۔ اس کے بعد اُس نے کوٹھے پر جانا چاہا لیکن سعید نے روک کر کہا کہ اس داڑھی اور ناک کے ساتھ میں نہ جانے دونگا۔ ان کو علیٰحدہ کیجئے کہ اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سعید نے یہ کہہ کر اس کی مصنوعی داڑھی اور ناک دونوں علیٰحدہ کر کے پھینک دیں اور فاطمہ کو یہ دیکھ کر کس قدر حیرت ہوئی کہ مختار آفندی شکیب ہی تھا لیکن یہ حیرت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ جلد ہی یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ اُس کا شوہر ایک نہایت ہی مشہور شخص تھا اور ترکی کے اُن نوجوانوں میں سے تھا جو شخصی حکومت کے ظلم سے بچ کر مصر میں پناہ گزین ہوئے تھے

اور اُس نے مصنوعی داڑھی اور ناک اس لئے لگائی تھی کہ ترکی کے جاسوس اُسے پہچان نہ سکیں اور شکیب کا پارٹ اس لئے ادا کیا تھا کہ وہ مصری اس "نوجوان خاتون" کی عفت و امانت کا امتحان کر سکے۔

(ترجمہ از عربی) (نگار جولائی ۱۹۲۶ء)

# بھوتوں کا شہر

مَیں بھوتوں کا قائل نہیں ہوں، صرف ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں، میرے دوست ابراہیم کا خیال ہے کہ مَیں اپنی اس بے اعتقادی پر بڑا فخر کرتا ہوں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، جب میرے سامنے بھوتوں کا ذکر آتا ہے، یا ارواحِ خبیثہ کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، تو مَیں اسے دلچسپی سے سنتا ہوں، ممکن ہے میرے انداز میں کوئی بات ایسی پیدا ہو جاتی ہو کہ اس سے ایک نوع کا اظہارِ تفوق مترشح ہوتا ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ میری فطرت ہی کچھ ایسی ہے اور ایک سرد خون کے غیر جذباتی انسان میں جس طرح کا جمود پایا پایا جا سکتا ہے، وہ میرے اندر پورے طور پر موجود ہے۔

میری اس فطری بے حسی میں بہت کچھ اضافہ اس بات سے بھی ہو گیا ہے، کہ کوئی مشغلہ نہیں رکھتا اور مجہول زندگی کا انسان یوں بھی رُوکھا اور غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنی اس حالت کا پُورا احساس ہے۔ اور یہ احساس بارش کے زمانہ میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، کیونکہ میری بیکاری خود میرے لئے بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور ایسے وقت میں ادنیٰ اسا غیر معمولی تغیر بھی مجھے اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔

کئی دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور مَیں برآمدہ میں بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ دیکھیے یہ طوفان کیا رنگ لاتا ہے۔ کہ مَیں نے ایک آدمی کو سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ اس وقت بالکل برہنہ معلوم ہو رہا تھا، جب میرے مکان کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو اندر کو مُڑ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وُہ برہنہ نہ تھا بلکہ اُس نے کپڑے کمر تک اُٹھا لیے تھے تاکہ پانی سے خراب نہ ہوں، وُہ آہستہ آہستہ بڑھا یہاں تک کہ برآمدہ میں آ گیا۔ اپنی چھتری بند کر کے کونہ میں رکھی، کپڑے نیچے کیے اور مجھے سلام کر کے آگے بڑھا۔

اس کا کوٹ قیمتی سرج کا تھا، قمیص کے کفوں میں سونے کے بٹن تھے اور کانوں میں ہیرے کی دو مُرکیاں پڑی ہوئی تھیں، صورت سے بھی نہایت

شریف معلوم ہو رہا تھا، مَیں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک کُرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کی اجازت دی۔

وہ بولا "میں بہت ممنون ہوُں کہ آپ نے اس وقت مجھے پناہ دی۔ مَیں آپ کو تکلیف نہ دیتا اگر مجھے قریب ہی کہیں جانا ہوتا"۔

مَیں نے کہا "اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، آپ شوق سے یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ موسم آجکل بہت خراب ہو رہا ہے"۔

وہ یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔ مَیں اس کی اس ادا سے بہت خوش ہوا کہ اُس نے آتے ہی فضول باتوں کا سلسلہ شروع نہیں کر دیا، کیونکہ مَیں خود بہت کم سخن ہوں، لیکن میرا خیال ابھی اس سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ دفعتہً وُہ بول اُٹھا "میرا نام شنکر نرائن ہے، اور کارکانی کا رہنے والا ہوں، چھ مہینے ہوئے کہ مجھے بورڈ کا وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا، مَیں آپ سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ آپ بھوتوں کے بھی قائل ہیں یا نہیں"؟

یہ سوال مجھ سے میری زندگی میں سینکڑوں مرتبہ کیا جا چکا تھا، لیکن اس قدر اچانک اس درجہ بے ربط اور اتنی مختصر نوٹس کے بعد کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، مَیں متحیّر رہ گیا۔ اور بمشکل اس کیفیّت کو دُور کر کے کہہ سکا کہ "میں

بھوتوں کا قائل نہیں ہوں، لیکن اس کی وجہ نہ پوچھیے، کیونکہ بغیر کسی دلیل و
سبب کے میرا یقین یہی ہے۔ آپ اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ خیر، یہ
اختلاف رائے ایسی زیادہ اہم بات نہیں ہے، آپ تو جو کچھ کہنا چاہتے تھے
اسے کہئے، ہاں۔

اس نے "نہیں جناب یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اگر آپ میرا قصہ سنیں گے
تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ بھوتوں کا یقین کرنا ضروری ہے۔"

"تو کوئی واقعہ آپ پر گزرا ہے؟"

"واقعہ! واقعہ سے زائد کوئی امر ہو سکتا ہے، تو وہ مجھ پر گزرا ہے۔
لیکن جب آپ کو اس سے دلچسپی نہیں تو اس کا ذکر بیکار ہے۔"

"نہیں، میں سنوں گا، کیونکہ باوجود اس کے مخالف ہونے کے میں اس
قسم کی کہانیاں سننے کا بہت شائق ہوں۔"

بارہ سال اس طرف کا ذکر ہے، کہ ایک شرط کے سلسلہ میں مجھے ایک
عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ کارکاپی سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر ایک شہر
ہے۔ جہاں اس زمانہ میں صرف بیل گاڑیوں کے ذریعہ سے لوگوں کی آمد و
رفت رہتی تھی۔ موٹروں کا رواج نہ تھا۔ چونکہ میں چلنے میں بہت مشّاق

ہوں۔ اِس لئے میں نے اپنے بعض دوستوں سے ان کے اشتعال پر یہ شرط کرلی کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر پیادہ پا وہاں پہنچ جاؤنگا۔ اور اس کیلئے تیار ہوگیا۔

اس شہر میں ایک رئیس تھا جو ہماری دکان سے جواہرات خرید اکرتا تھا۔ اُس نے حال ہی میں اپنی لڑکی کی شادی کیلئے چند جواہرات کی فرمائش بھی کی تھی، اس لئے میں نے خیال کیا کہ اسے بھی ساتھ لیتا چلوں اور دہیں سامنے جاکر معاملہ کرلوں، چنانچہ میں نے ان کو ایک ڈبیا میں بند کرکے نہایت حفاظت سے اپنے جسم کے متصل کپڑے میں لپیٹ لیا، اور بخیال مزید حفاظت اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے لیا جو میری ہی طرح چلنے کا عادی اور اس قسم کے سفر کا بڑا شائق تھا۔

آخرکار ایک دن سورج نکلے ہم روانہ ہوئے، شرط کے مطابق اگلے دن صبح کو وہاں پہنچنا تھا، اس سفر کا ابتدائی حصّہ نہایت لطف سے گزرا۔ موسم خوشگوار تھا، سڑکوں کے درخت سایہ دار تھے، اور ہماری ہمتیں تازہ تھیں ۶ بجے شام تک ۱۵ میل ہم نے طے کئے اور تھوڑی دیر دم لینے کے لئے سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔

چند منٹ میں ہم تازہ دم ہوگئے اور اپنا سفر پھر شروع کردیا، اب

رات کی تاریکی بڑھ چلی تھی۔ آسمان صاف تھا اور ستارے چمک رہے تھے کچھ دیر تک چلنے کے بعد دفعتاً میرے بھائی نے مجھ سے کہا۔ "یہ روشنیاں کیسی نظر آ رہی ہیں؟" اس وقت ہم سڑک کے بلند حصّے سے گزر رہے تھے، مَیں نے اس کے اشارہ کی سمت میں نظر ڈالی تو دیکھا کہ سامنے وادی میں تقریباً ایک میل سے کم فاصلہ پر ہزاروں روشنیاں جھلملا رہی ہیں، جیسے کسی شہر میں چراغاں ہو رہا ہے، میں بارہا اس راستہ سے گزرا تھا اور یہاں کوئی شہر آباد نہ تھا، اس لئے میں متحیّر رہ گیا۔ اور حیرت آمیز خاموشی کے ساتھ سفر جاری رکھا۔ آخر کار ہم اس شہر میں پہنچے اور اس کی صاف ستھری سڑکوں سے گزرے دو رویہ بڑے بڑے مکان بنے تھے، عالی شان مندر قائم تھے اور سب جگہ ایسی روشنی ہو رہی تھی۔ جیسے کسی خاص تقریب جشن میں چراغاں کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا لوگ عمدہ لباسوں میں اِدھر سے اُدھر گزر رہے تھے اور سامنے سے ایک جلوس آ رہا تھا جس کے ساتھ باجے بھی تھے، مشعلیں بھی تھیں، اور پجاریوں کی ایک جماعت بھی، ازیادہ قریب سے جب ہم لوگ گزرے تو ہم نے دیکھا کہ ان کا لباس عجیب قسم کا تھا۔ اور وہ ہمیں اور ہم انہیں دیکھ کر حیرت کر رہے تھے، لیکن چونکہ

ہم کو شرط جیتنے کا بھی خیال تھا۔ اس لئے جلدی جلدی اس شہر سے گزرنا چاہا۔ مگر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب باوجود متعدد بار کوشش کرنے کے ہم لوٹ لوٹ اسی جگہ آگئے اور باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا، ہم نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اور ہمیں دیکھ کر ہنسنے لگے۔

ایک گھنٹہ کے بعد ہم اس شہر میں ایک دھرم سالہ کے پاس پہنچے، جہاں بہت چہل پہل نظر آرہی تھی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی بڑی دعوت کا انتظام ہو رہا ہے، یہاں پہنچکر ہم نے راستہ دریافت کرنا چاہا، صاحبِ خانہ یا یہاں کے مہتمم نے نہایت اخلاق سے اُٹھ کر ہماری پذیرائی کی اور کھانے پر مجبور کیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کہا کہ رات کو سفر کرنا مناسب نہیں اور زبردستی ہمارے آرام کرنے کا بھی انتظام کر دیا، ہم نے اس سے کہا کہ ہم سفر کرنے پر مجبور ہیں، اور کسی طرح ہم قیام نہیں کر سکتے، لیکن دفعتہً ہم اونگھنے لگے اور تھوڑی دیر میں ہم غافل ہو گئے۔

صبح کو جب آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کے پاس پڑا ہُوا ہُوں اور قریب ہی میرا بھائی بھی سو رہا ہے، مَیں نے اُٹھ کر اُسے بیدار کیا تو تھوڑی دیر تک وُہ بھی بھیانک صُورت بنائے ہُوئے اِدھر اُدھر

دیکھتا رہا اور پھر جب رات کے تمام واقعات کو اپنے ذہن میں دُہرا چکا، تو ہنس کر بولا: "بھائی جان شرط تو آپ ہار گئے۔ کیونکہ ہم ۲۵ میل دُور ہیں۔"

یہ سُن کر فوراً مجھے اپنے جواہرات کا خیال آیا کہ کہیں وُہ تو غائب نہیں ہو گئے۔ لیکن مَیں نے اپنی کمر کو ٹٹولا تو مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ ڈبیا موجود تھی۔ زیادہ اطمینان کے لئے مَیں نے گرہ کھول کر ڈبیا کو کپڑے کے اندر سے نکالا۔ لیکن جب ڈھکنا کھولا تو مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ کیونکہ بجائے جواہرات کے اس میں سنگ ریزے بھرے ہوئے تھے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت میری حالت کیا رہی ہو گی۔ شرط بھی ہارے اور آٹھ ہزار کے جواہرات بھی ہاتھ سے گئے۔ تھوڑی دیر تک مجھ پر سکتہ کی سی حالت طاری رہی۔ اور پھر جب حواس ذرا دُرست ہوئے تو یہ رائے قرار پائی کہ قریب کے تھانہ میں جا کر اطلاع کرنی چاہیئے۔ لیکن جس نے ہماری سرگزشت سُنی وُہ ہنسنے لگا اور کسی نے یقین نہ کیا کیونکہ وہاں کسی شہر کا وجود ہی نہ تھا سب یہی سمجھتے تھے کہ ہم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

ایک مہینہ بعد ہمیں ایک نہایت ضعیف آدمی ملا اور اس نے بیان کیا

کہ کئی صدیاں گذریں جب یہاں ایک شہر جینیوں کا تھا جو عرصہ ہؤا برباد ہو گیا۔ لیکن اب بھی ہر بارھویں سال وُہ ایک رات کے لئے وجود میں آجاتا ہے"
اتنا کہنے کے بعد ذرا رُک گیا۔ مَیں نے پوچھا۔ کہ "اُس ضعیف آدمی نے کوئی تدبیر جواہرات کی واپسی کی بھی بتائی تھی یا نہیں"۔

"ہاں اُس نے کہا تھا کہ اگر بارہ سال بعد ٹھیک اسی وقت تم اس مقام پر پہنچ جاؤ تو جواہرات کا مل جانا ممکن ہے"۔

"پھر اس نے کہا کہ اس کو بارہ سال کا زمانہ گذر گیا ہے۔ اگر آپ کا شمار صحیح ہے تو کیوں نہیں آپ اس کی کوشش کرتے"۔ یہ سُن کر وُہ نوجوان چونک پڑا اور بولا کہ یقیناً اس واقعہ کو ٹھیک بارہ سال کا زمانہ ہو گیا ہے اور مجھے وہاں جانے کی کوشش کرنی چاہئے"۔

یہ کہہ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور چونکہ بارش بھی بند ہو گئی تھی اس لیے ہات ملا کر رخصت ہو گیا لیکن یہ وعدہ مَیں نے اس سے لے لیا کہ جو نتیجہ پیدا ہو اس کی اطلاع ضرور مجھے دی جائے۔

اس افسانہ کو اس جگہ ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا ایک ضمیمہ بھی ہے جو نہایت اہم ہے اور وُہ یہ کہ اس ملاقات کے تین دن بعد میرے

مکان میں نقب لگا اور ۱۴۰۰۰ کی قیمت کے جواہرات چوری ہو گئے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور اُس نے بہت کوشش بھی تفتیش میں کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ایک مہینہ بعد مجھے شنکر نرائن کا ایک خط ملا جس میں یہ عبارت درج تھی :۔

جناب من !

مَیں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ نتیجہ سے اطلاع دونگا۔ اِس لئے میں حسب وعدہ آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ مَیں کامیاب ہو گیا اور نہ صرف مجھے ۸ ہزار کے جواہرات واپس ملے بلکہ ۶ فیصدی سُود کے حساب سے بارہ سال کا نفع بھی مل گیا اور ۱۴۰۰۰ کی قیمت کے جواہرات عطا ہوئے۔

یقین ہے کہ اب آپ بھوتوں کے وجود کے ضرور قائل ہو گئے ہونگے اور اپنی رائے کو واپس لیں گے۔

ہاں ایک امر اور قابلِ گذارش ہے کہ بارہ سال کے شمار میں تین دن کی غلطی ہو گئی تھی جس دن میں آپ سے ملا ہوں

اس کے تین دن بعد بارہ سال کا زمانہ ختم ہونے والا تھا۔"

آپکا وفادار۔ شنکر نرائن

اس خط میں نہ کوئی تاریخ درج تھی اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہاں سے ڈالا گیا۔

غالباً اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بھوتوں کی طرف سے جو بے اعتقادی مجھے تھی اس میں اب اور زیادہ شدت ہو گئی ہے اور مجھے اب ایسے افسانوں سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔

(ماخوذ) (نگار فروری سنہ ۱۹۲۵ء)

# رستم نپولین کا غلام

گذشتہ صدی کی ابتدا میں کرۂ ارض پر ایک عظیم الشان طوفان بپا ہوا جس نے متعدد شاہی تختوں کو الٹ دیا۔ اور بڑے بڑے تاجداروں کے سر ایک ایسے جبّار فاتح کے قدموں میں ڈال دیئے جس کے آگے تقریباً یورپ کی تمام قوموں نے سرِ تسلیم طوعاً کرہاً خم کر دیا تھا۔ اس جبّار کے ساتھ سفر و حضر میں ایک اجنبی ہیئت غلام رہا کرتا تھا جس نے اپنے آقا کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ وہ تختِ سلطنت سے گرا کر ایک جزیرہ میں قید نہ کر دیا گیا۔ یہ جبّار نپولین تھا اور یہ وفا شعار خادم اس کا غلام رستم جس کو وہ اپنے ساتھ مصر سے لایا تھا۔

رستم رضا بن رستم کوفان ۱۷۸۲ء میں شہر تفلیس کے اندر پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کی معطر ہوا، سنہرا آسمان اور وہاں کی مسرور زندگی کا تذکرہ شعرا کی زبان پر رہتا ہے۔ رستم نے اپنا دورِ طفولیت تفلیس کے گلزاروں اور مرغزاروں میں بسر کیا، لیکن وہاں کے حسین مناظر کو امتدادِ زمانہ نے اس کے متخیلہ سے بالکل زائل کر دیا تھا، کیونکہ وہ نہ فطری شاعر تھا اور نہ ماہر مصوّر۔ زمانہ نے اسکے متخیلہ سے وطن کی دلکش اور خوبصورت سرزمین کا نقشہ بالکل مٹا دیا تھا، اور اس میں جائے حیرت نہیں کیونکہ جو حوادث اس پر گذرے وہ حقیقت میں ایسے سخت تھے جنہوں نے اسے یادِ ماضی کیلئے ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ نہ چھوڑا تھا۔

اربابِ تاریخ کا بیان ہے کہ رستم کا باپ طبابت کا پیشہ کرتا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ تاجر تھا۔ اس کی چار اولاد ہوئیں جن میں سے ایک رستم بھی تھا۔ رستم نے عہدِ طفلی ۱۷۹۵ء تک اپنے وطن میں گزارا، لیکن اس کے بعد اس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا، جو عجیب و غریب حوادث سے لبریز ہے۔

رستم اپنی یادداشت میں (جو اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئی) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی ماں سے بہت زیادہ محبّت تھی، اور یہی محبّت اس کی مصیبتوں کا باعث ہوئی۔ باپ اس سے ناراض ہوا اور اس نے رستم کو اپنے گھر سے

نکال دیا۔ اب رستم آوارہ و سرگرداں بھیک مانگتا ہوا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پھرنے لگا۔ اتفاقاً اس زمانہ میں اس مُلک کے قبائل کے درمیان ایک سخت جنگ شروع ہوئی۔ رستم نے مارے خوف کے ایک قلعہ میں پناہ لی۔ اور وہاں ایک عرصہ تک قیدیوں کی طرح بند رہا، جب اس کا دل قید سے بہت تنگ آگیا تو وُہ قید خانہ سے بھاگا، اور اپنی ماں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اس کی ماں اپنے شوہر کو چھوڑ کر علیحدہ ہوگئی تھی، اور اپنی اولاد کے ساتھ علیحدہ رہتی تھی، رُستم نے سے ایک عرصہ تک تلاش کیا۔ چنانچہ مدّت کے بعد اس کا پتہ چلا، اب وُہ اپنی ماں کے پاس رہنے لگا تھا۔ لیکن وہ اس سعادت سے کچھ زیادہ عرصہ تک بہرہ مند نہ ہوسکا، اور اس پر ایسے مصائب نازل ہوئے جن کی وجہ سے اسے ملک چھوڑنا پڑا، اور تلاشِ معاش کے لئے وُہ باہر نکلا۔ اثنائے راہ میں جب کہ یہ غریب خاندان قطع منازل میں مصروف تھا، مردم فروشوں کی ایک جماعت نے ان پر حملہ کیا، اور سب کو گرفتار کرکے لے گئے اور بیچ ڈالا۔ اب رستم اپنے بھائیوں اور والدہ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ رستم کو ایک عورت نے خریدا، اس کو رستم سے بہت محبت ہوگئی اور اسے اپنا متبنیٰ بنالیا۔ لیکن اس کے شوہر کو ایک اجنبی کا وجود اپنے گھر میں پسند نہ آیا، اور اس نے

رستم کو ایک مصری سردار کے ہاتھ فروخت کر دیا، جس نے رستم کو اپنے غلاموں کے ساتھ شریک کر لیا۔

مصر اس زمانہ میں ایک عثمانی صوبہ تھا جس پر دولتِ علیّہ کی طرف سے ایک حاکم حکومت کرتا تھا۔ لیکن حقیقت میں سیاہ و سفید کے مالک ممالیکِ مصر تھے۔ یہ ممالیک نہایت شان و شوکت سے رہتے تھے، لباسِ فاخرہ پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، اور تین چار آدمی پیدل ان کی جلو میں ہوا کرتے تھے۔ مصری ان کے مظالم سے سخت تنگ آ گئے تھے اور وُہ ان سے سخت نفرت رکھتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد رُستم اپنے اہل و اقارب کو بھول گیا اور اپنے مصری آقا کے ساتھ عیش و تنّعم کی زندگی بسر کرنے لگا۔ وُہ اپنے آقا کے ساتھ حج کیلئے گیا اور دو ماہ کے اندر سوریا کے راستہ سے واپس ہوا، وہاں خبر ملی کہ فرانسیسی لشکر نے ممالیک پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اب رستم کا آقا اپنے غلام کے ساتھ عکا کے ایک سردار کے یہاں مہمان ہوا، چند روز تک تو اس نے معمولی طریقہ سے مہمان نوازی کی، مگر آخر میں اس نے قہوہ میں زہر ملا کر پوری طرح مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ جب رستم کا آقا مر گیا تو رستم وہاں سے مصر کی طرف بھاگا۔

وہاں اس کا ایک ملنے والا مصر کے ایک مشہور خاندان کے ایک سردار کے پاس لے گیا۔ اس نے رستم کو اپنے پاس رکھا اور پچیس غلاموں پر اس کو سردار مقرر کیا۔

جب بونا پارٹ حملۂ شام سے واپس ہوا، تو یہ سردار اس کی ملاقات کے لئے نکلا۔ اور اس نے نپولین کو ایک گھوڑا بطور ہدیہ کے دیا جس کی لگام رستم کے ہاتھ میں تھی، نپولین نے شکریہ کے ساتھ گھوڑا قبول کیا۔ کچھ دنوں کے بعد نپولین نے اس سے دو غلام طلب کئے تاکہ وہ انہیں اپنے ملک میں لے جائے۔ اس نے رستم اور ایک اور غلام بونا پارٹ کو دیا۔ چند روز بعد نپولین رستم کو لے کر فرانس روانہ ہوا جس روز نپولین نے رستم کو اپنے خاص خدّام کے ساتھ شامل کیا تو اس نے رستم کو ایک مرصّع تلوار اور دو تفنچے جن کے دستے سونے کے تھے، عنایت کئے۔

اثنائے سفر میں نپولین کے رفقا رستم کے ساتھ مذاق کرتے تھے اور اسے بہت چھیڑتے تھے۔ ایک روز سب نے کہا کہ نپولین تم کو اس لئے پیرس لے جا رہا ہے کہ وہاں ایک عام جلسہ میں تمہارا پیٹ چاک کیا جائیگا اور سب تماشہ دیکھیں گے، رستم اس خبر کو سچ سمجھا اور اسے اپنی جان کا بہت خوف

ہُوا، جب نپولین کو اس کی خبر ہوئی تو وُہ بہت ہنسا اور رستم کو بلا کر تسلی دی اور اطمینان دلایا۔

نپولین نے اپنے غلام کو مرسیلیا میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہاں اس کی حالت یہ تھی کہ تمام لوگوں کی نظریں اس کی طرف بہت اُٹھتی تھیں۔ اس کے پاس اکثر عورتیں آیا کرتی تھیں اور اس سے مذاق کیا کرتی تھیں۔ چند روز اسی حالت میں گزرے، یہاں تک کہ پیرس جانے کا دن آگیا، اور رستم بھی تمام خدام کے ساتھ پیرس روانہ ہُوا، راستہ میں ڈاکوؤں کی ایک جماعت اس قافلہ پر حملہ آور ہوئی اور رُستم کی مرصّع تلوار اور روپیوں کی تھیلی جس میں چھ ہزار فرانک تھے لوٹ لی۔

جب رستم پیرس پہنچا تو نپولین کی بیوی جوزفائن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ رستم کی شکل و صورت اسے بہت پسند آئی۔ اور اس کو خاص اپنی خدمت میں رکھا، جوزفائن کے دشمنوں نے یہ خبر اُڑائی کہ جوزفائن نے اپنے عشاق کی جماعت میں رستم کو بھی داخل کر لیا ہے۔ نپولین کی غرض رستم کے لانے سے یہ تھی کہ اس کی بیوی اسے دیکھ کر خوش ہو اور پیرس والے بھی اسے مشرقی لباس میں دیکھیں اور اس کے حُسن و جمال پر تعجّب کریں، جب نپولین اس

محل میں منتقل ہوا جو حکومت نے اس کے رہنے کے لئے تجویز کیا تھا تو اُس نے اپنی ذات خاص کی حفاظت رستم کے سپرد کی، رستم اس کے سونے کے کمرہ میں اس کے ساتھ سویا کرتا تھا اور کسی شخص کو بغیر اطلاع نپولین کے پاس جانے نہیں دیتا تھا، ایک رات جوزفائن کو یہ خیال ہوا کہ آج نپولین کسی دوسری عورت کے ساتھ محوِ خلوت ہے وُہ تحقیق کے لئے اپنی خادمہ کو لے کر اس کے کمرہ کی طرف روانہ ہوئی، وہاں پہنچکر جب اس نے رستم کا خوفناک خرّاٹا سنا تو مارے ڈر کے وہاں سے بھاگی۔

علاوہ رات کی حفاظت کے رستم کا ایک کام یہ بھی تھا کہ صبح کے وقت نپولین کے خط بنانے میں اس کی مدد کرتا تھا، رستم آئینہ لے کر کھڑا ہوتا تھا اور نپولین اپنی داڑھی مونڈتا تھا۔ نپولین اکثر اس سے کہا کرتا تھا "گدھے آئینہ سیدھا پکڑنا یہ تیری خوش نصیبی ہے کہ تیرا آقا کوئی مصری نہیں ہے ورنہ تیری گردن ہی اُڑا دیتا۔" اس سے فارغ ہونے کے بعد غسل میں بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ دربار میں جاتا تھا اور ایک لمحہ کے لئے اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ کلیپر کا بیان ہے کہ نپولین کو کسی سے محبّت نہ تھی اگر وہ کسی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا تو اسے انعام و اکرام سے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جو

کچھ قمار بازی میں اسے حاصل ہوتا تھا، وُہ سب رستم کو دے دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ صرف تین روز میں رستم کو تین ہزار فرانک ملے۔ نپولین کی اس داد و دہش پر ادر خادم حسد کرتے تھے اور رستم سے دشمنی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ مشہور کیا کہ نپولین جس کو علانیہ قتل نہیں کر سکتا اسے رستم کے ذریعہ سے قتل کراتا ہے

سفر و حضر میں رستم سایہ کی طرح بونا پارٹ کے ساتھ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ فوجی نمائشوں میں بھی وُہ نہایت زرق برق لباس پہنے نپولین کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ اس کا ریشمی لباس جس پر خالص سونے کا کام ہوتا تھا۔ اور اس کا مرصّع زین جو چیتے کی کھال کا ہوتا تھا۔ خاص طور سے لوگوں کی نظریں اپنی طرف متوجہ کرتا تھا، وُہ تھیٹر میں بھی نپولین کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اور اس وقت اس کا خاص لباس بہت کچھ التفات کا باعث ہوتا تھا۔ وُہ جس روز تھیٹر میں جاتا تھا۔ دوسرے روز اخبارات میں اس کا ذکر شائع ہوتا تھا۔ جب وُہ راستہ پر گزرتا تھا تو دُور تک لوگوں کا ہجوم اس کے ساتھ شور کرتا تھا اور وُہ نہایت متانت اور بے پروائی سے چلا جاتا تھا۔

عورتیں جیسا کہ ان کی عادت ہے ہر ایک جدید اور نادر چیز سے دلچسپی لیتی ہیں، رستم کا مشرقی لباس انہیں بہت پسند آیا، اور انہوں نے بھی

اس کی تقلید شروع کی۔ خود جوزفائن اور ملکہ پروشیا نے رستم کے لباس کی طرز اختیار کی، مائیں اکثر اپنے بچوں کیلئے ریشمی لباس بناتی تھیں، بلکہ اس مرض نے یہاں تک ترقی کی کہ خود نپولین نے ایک جوڑا اپنے لیے اسی طرز کا تیار کرایا۔ اس عہد کے بڑے بڑے ماہر مصوّرین نے اس مشرقی غلام کی تصویریں لیں اور تمام یورپ میں اس کی شہرت ہوگئی۔

جب نپولین کی تاجپوشی کا دن (جس روز وہ شہنشاہ بنایا جانے والا تھا) قریب آیا تو اس نے محل کے درزی کو حکم دیا کہ رستم کے لئے ایک نہایت بیش قیمت لباس تیار کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے دو جوڑے تیار کیے ایک پر سات ہزار فرانک اور دوسرے پر تین سو خرچ ہوئے، اس جوڑے اور جوتوں کی قیمت ایک سو بیس فرانک تھی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ رقم بہت زیادہ تھی، جلسہ کے روز غلام نے اپنا قیمتی لباس پہنا اور اپنی مرصّع تصویر لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور نہایت شان کے ساتھ شاہی سواری کے آگے رہا۔

نپولین کے سایۂ دولت میں رستم نے نہایت عیش کی زندگی بسر کی جس پر ہر خاص و عام رشک کرتے تھے۔ تمام مجالس اور محافل میں رُستم

تخت شاہی کے بازو میں بیٹھتا تھا۔ سو شاہی سواروں میں بادشاہ کے پیچھے سوار ہوتا تھا، جب کوئی شہر فتح ہوتا تھا تو نپولین کے پیچھے رستم بھی فاتحانہ شان سے داخل ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اسے سلطنت کا ایک رکن اعظم خیال کرتے تھے، اس کی سفارش بھی نپولین کے نزدیک بڑی وقعت رکھتی تھی۔

جس زمانہ میں نپولین کا قیام پیرس میں ہوتا تھا۔ رستم روزانہ ایک یا دو گھنٹے لوگوں کی ملاقات کے لئے مقرر کرتا تھا۔ اور ان لوگوں سے خاص طور سے ملتا تھا جن کی لڑکیاں خوبصورت ہوتی تھیں لیکن نپولین جب میدانِ جنگ کو روانہ ہوتا تھا تو رستم ایک لمحہ کے لئے اس کو نہیں چھوڑتا تھا، تمام ضروریات فراہم کرنا اسی کے ذمہ تھا، نپولین کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا وہ اکثر بغیر کھانا کھائے سو جاتا تھا۔

ایک شب کو جب کہ آدھی رات گزر چکی تھی نپولین اپنے سونے کے کمرے میں داخل ہوا اس وقت تک اُس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ رستم نے سوچا کہ وہ اب کھانا نہیں کھائے گا، بھوک اسے شدّت کی تھی، جو مُرغی آقا کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اس میں سے آدھی رستم نے کھالی۔ تھوڑی دیر

کے بعد نپولین نے رستم سے کھانا لانے کے لئے کہا، رستم بچی ہوئی مرغی لے گیا۔ نپولین نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا میں نے آج تک کہیں ایک بازو اور ایک ران کی مرغی نہیں دیکھی اور نہ کبھی مجھے یہ خیال ہوا کہ میں دوسروں کا بچا ہوا کھانا کھاؤں گا۔ رستم مارے خوف کے کانپنے لگا، اور کہا کہ میں بہت بھوکا تھا۔ اس لئے میں نے پہلے ایک ران اور پھر ایک بازو کھا لیا یہ سُن کر نپولین خاموش ہو گیا اور وہی آدھی مرغی کھا کر سو گیا، صبح کے وقت بوناپارٹ نے ایک فوجی افسر کو کچھ ہدایت کرنے کو بلایا، رستم نپولین کے پاس کھڑا تھا۔ نپولین نے افسر سے کہا، تمہیں خبر ہے کہ میں نے گذشتہ رات اپنے سردار رستم کا بچا ہوا کھانا کھایا، اس کے بعد رستم سے کہا ادھر آؤ ملعون تاکہ میں تیرے کان کھینچوں، اب ہرگز ایسا نہ کرنا، یہ کہہ کر نپولین بھی قہقہہ مار کر خوب ہنسا۔

رستم کے حسن و جمال کے باعث عورتوں کی نظریں خاص طور سے اُس کی طرف اُٹھتی تھیں۔ رستم کے بہت سے افسانہائے محبت ہیں، جنہیں وُہ اپنے آقا کو سنایا کرتا تھا۔ مصر میں بھی ایک شریف خاندان کی لڑکی اس کے دامِ محبت میں پھنس گئی تھی، پیرس کی مرد نواز عورتیں تو رستم پر نثار ہوئی جاتی

تھیں۔ جوزفائن خاص طور سے اس کا خیال رکھتی تھی، اگر وہ بیمار ہوتا تو روزانہ اس کی عیادت کو آتی تھی، ایک دفعہ رستم کے سر میں کچھ زخم آ گیا جس کی وجہ سے وہ اپنے آقا کے ساتھ اٹلی نہ جا سکا۔ نپولین نے اس سے کہا تم غم مت کرو۔ میں عنقریب تمہارے پاس واپس آؤنگا۔ میری بیوی تمہارا بہت خیال رکھے گی اور تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ آنے دیگی۔ جوزفائن کی بیٹی (پہلے شوہر سے) رستم کو اپنے کمرہ میں بلایا کرتی تھی، اگر رات زیادہ ہو جاتی اور رستم اونگھنے لگتا تو وہ کہتی رستم سو مت میں تم کو ایک اچھا گانا سناتی ہوں، اسے بہت کچھ ہدیے اور تحفے دیا کرتی تھی۔ اسی طرح محل کی تمام عورتوں کا معاملہ اس کے ساتھ تھا۔

نپولین کی بہن کارولین جو بعد میں اٹلی کی ملکہ ہو گئی ایک شریف خاندان کی لڑکی سے رستم کی شادی کرانی چاہی۔ لڑکی کے باپ نے رستم کا مرتبہ دیکھتے ہوئے نہایت خوشی سے منظور کر لیا۔ لیکن نپولین نے اسے رستم کی بیوی ہونے کے لائق نہ سمجھا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد رستم الگزنڈرا ڈوفیل کے دامِ محبت میں پھنس گیا۔ اس نے اپنے آقا سے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت

چاہی، نپولین نے پُوچھا اس کے پاس کچھ مال بھی ہے۔ رُستم نے کہا مال تو کچھ نہیں مگر جب تک میں آپ کی خدمت میں ہُوں مجھے مال کی کیا ضرورت ہے۔ نپولین نے اس کی استدعا قبول کر لی۔ لیکن وُہ آسٹریا پر حملہ کر رہا تھا۔ اس نے اس سے کہا کہ حملہ سے واپس ہونے کے بعد یہ تاریخ شادی مقرر کی جائیگی، چار مہینہ تک حملہ جاری رہا۔ رستم نپولین کے ساتھ تھا۔ یہ چار مہینہ چار برس سے زیادہ طویل تھے۔ جب نپولین حملہ سے کامیاب ہو کر پیرس واپس ہٹوا ہو تو اُس نے شادی کی تاریخ مقرر کی اور پہلی فروری ۱۸۰۶ء کو رستم کی شادی الگزنڈرا ڈوفیل سے ہو گئی، شادی کے تمام مصارف نپولین نے اپنی جیب خاص سے دیئے۔ ایک سال کے بعد رستم کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اشیل رکھا گیا۔ نپولین نے رستم کو مبارکباد دی اور کہا کہ بجائے ایک غلام کے اب میرے دو غلام ہو گئے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ وُہ بھی ایک روز تمہارے مرتبہ کو پہنچے گا، نپولین بچّہ کو اپنے کمرہ میں بلاتا اور اسے کھلایا کرتا تھا اور جب ماں کے پاس واپس کرتا تو اس کے ہاتھ میں اشرفیاں رکھ دیتا تھا۔

یہ وُہ زمانہ تھا جب کہ نپولین ممالک یورپ کو فتح کر رہا تھا۔ فتح و ظفر

ہمیشہ اس کی رفیق رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب قدرت اس کی سرکشی پر برہم ہوئی اُس نے رُوس پر حملہ کیا اور وہاں کے تاریک جنگلوں میں موت کے فرشتوں نے اس کی جرّار فوج کا خاتمہ کر دیا، اور وہاں سے صرف اپنے غلام رستم کی رفاقت میں نہایت ذلّت و خواری سے واپس ہوا۔ رستم نے ابھی تک اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

یہ خیال ایک لمحہ کیلئے بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا کہ اس کا غلام رستم جس نے نپولین کے سایۂ دولت میں سرداروں کی سی زندگی بسر کی تھی وُہ بھی اس سے بیوفائی کرے گا، ۱۶ اپریل ۱۸۱۴ء کو جب نپولین سلطنت سے دست بردار ہوا اور جلاوطن ہونے کی تیاریاں کرنے لگا تو اس وقت رستم نے اس کی رفاقت پسند نہیں کی۔ وُہ اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس امر میں اس سے مشورہ چاہا۔ اُس نے کہا کہ شرافت تو یہی ہے کہ تم کو کسی حالت میں بھی نپولین کا ساتھ نہ چھوڑنا چاہیے۔

رستم اپنی بیوی کے پاس نپولین کی اجازت کے بغیر چلا گیا تھا اس سے وُہ سمجھا تھا کہ اب رستم بھی اوروں کی طرح واپس نہ آئیگا۔ جب رستم واپس آیا تو اس کے دوسرے روز نپولین نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ اس نے

وُہ زہر جو ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا کھا لیا، مگر چونکہ فوراً اس کی اطلاع ہو گئی اطبا نے تدارک کیا، اس سے موت سے بچ گیا۔ دوسرے دن نپولین نے رستم سے اپنا تفنچہ مانگا، اس نے مارشل برٹیہ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا جو تمہارے جی میں آئے کرو میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن رُستم کے ایک دوست نے کہا تم ایسا ہرگز نہ کرو ورنہ تمہارے دشمن یہ مشہور کرینگے کہ تم نے اپنے آقا سے غدّاری کی اور دشمنوں کے لالچ دینے پر قتل کر دیا۔

رستم نے اس کے بعد نپولین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، جب نپولین سوار ہو کر پیرس سے رخصت ہونے لگا تو رستم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم رستم کی یادداشت سے وُہ رقوم نقل کریں جو اس کو مختلف اوقات میں اسے عطا کیا کرتا تھا۔ رستم کا بیان ہے کہ ابتدا میں اس کے لئے کوئی خاص رقم مقرّر نہ تھی۔ نپولین کو بھی اس کا خیال نہ تھا۔ اتفاقاً اس کا ذکر آیا، اس روز نپولین نے اس کے لئے ایک ہزار دو سو فرانک کا وظیفہ مقرر کیا جو بعد میں دو ہزار چار سو تک بڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ دو ہزار چار سو فرانک اس بات کے مقرّر تھے کہ وُہ شکار میں نپولین کی بندوق اُٹھایا کرتا تھا اور نو سو فرانک سالانہ انعام کے طور پر مقرّر تھے۔ اس

کے سوا جو کچھ نپولین قمار بازی میں حاصل کرتا تھا وہ سب رستم کو ہبہ کر دیتا تھا۔ قومی اور مذہبی تقریبات کے موقع پر گراں قدر عطئے رستم کو ملا کرتے تھے ۱۸۰۸ء میں ۲۰۰۰ ہزار فرانک، ۱۸۱۰ء میں ۳۰۰۰ ہزار، ۱۸۱۱ء میں ۴۰۰۰ ہزار ۱۸۱۲ء میں چھ ہزار، ۱۸۱۳ء میں چھ ہزار فرانک ملے تھے، تخت سلطنت سے دست بردار ہونے سے کچھ پہلے پچاس ہزار فرانک کی رقم خطیر اسے دی گئی تھی۔

ان رقوم سے معلوم ہوتا ہے کہ نپولین نے اپنے غلام کے ساتھ کیسا سلوک کیا، جس قدر بوناپارٹ کے احسانات اس کے حق میں زیادہ ہیں، اسی قدر رستم کی خیانت اس کے حق میں بڑھی ہوئی ہے۔ اس لئے سینٹ ہلنا میں نپولین اس کا ذکر ہمیشہ لعنت و نفرت سے کیا کرتا تھا۔

سقوط نپولین کے بعد رستم نے اپنی بقیہ زندگی مقام دوردان میں بسر کی جہاں اس نے ایک مکان خرید لیا تھا۔ اس کے پاس کسی کی آمد و رفت نہیں تھی، جو لوگ اسے پہچانتے تھے وہ نہایت نفرت و حقارت سے اس کا نام لیا کرتے تھے، فرانسیسیوں کی نفرت زیادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نپولین کی جلاوطنی کے بعد رستم نے دو مرتبہ انگلستان کا سفر کیا اور وہاں نپولین کے

شدید ترین دشمنوں کے سامنے اپنے سرکاری کپڑے صرف مال حاصل کرنے کی غرض سے پہنے اور انگلستان میں وہ تمام ہدیے اور تحفے بیچ ڈالے جو نپولین یا اور محل کے لوگوں نے اسے دیئے تھے، چنانچہ منجملہ ان کے ایک سونے کا ٹکڑا ابھی تھا جس پر یہ الفاظ لکھے تھے "نپولین کی طرف سے ایک یادگار ہے جو اس کے امین غلام رستم کو دی جاتی ہے"۔

رستم کا انتقال، دسمبر ۱۸۴۵ء کو ہوا اس سے پہلے اس کا بیٹا اشیل اور ایک بیٹا جو اس کے بعد پیدا ہوا تھا مر چکا تھا۔ اس کے خاندان میں سے صرف اس کی بیوہ اور ایک بیٹی تھی جس نے ایک فرانسیسی تاجر کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

رستم کی قبر دوردان کے قبرستان میں ہے جس پر ذیل کا کتبہ لگا ہوا ہے

**یہاں شہنشاہ نپولین کا محبوب غلام رستم سو رہا ہے**

**جو**

تفلیس (جارجیا) میں پیدا ہوا اور دوردان میں ۶۴ سال

کی عمر میں اس نے انتقال کیا، اور اپنے اس خاندان کیلئے

رنج وحسرت چھوڑتا ہوا رخصت ہو گیا جو اس کی بہت
عزّت کرتا تھا، اے رستم تو ان لوگوں میں آرام سے سو نا رہ
جنہوں نے تیری قدر پہچانی اور تیرے ساتھ محبت اور عزّت
کا سلوک کیا۔

(نگار، ۷، فروری ۱۹۲۵ء)

# خواب کے بعد بیداری

(۱)

سعید یوں تو نہایت ذی فہم تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ لیکن بدقسمتی سے تھا اُن لوگوں میں سے جو دنیا کو ہمیشہ دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

وہ ایک متمول گھرانے کا لڑکا تھا۔ لیکن باپ کی فضول خرچیوں نے اس کے لئے سوائے ایک مکان کے اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ اگر یہ مکان کسی بڑے شہر میں ہوتا تو یقیناً تیس چالیس روپیہ ماہوار اس کا کرایہ آتا۔ لیکن اناؤ ایسی بستی میں اسے کون پوچھتا۔ جب سعید کبھی اناؤ آتا تو چند دن کے لئے یہ مکان

مہینے کے بعد جب سعید کے قیام وغیرہ کا انتظام درست ہو جائیگا تو حمیدہ بھی وہیں چلی جائیگی۔ لیکن اس کا ایسا خیال کرنا بھی اس کی حد درجہ نیکی کا ثبوت تھا کیونکہ جو تلخ تجربات اس کو ہو چکے تھے۔ اُن کی بنا پہ اُسے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا چاہیے تھا اور اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ سعید ایک مرتبہ آزاد ہو جانے کے بعد پھر کبھی اس کے قابو میں آنے والا نہیں۔

چونکہ سعید کی فطرت اور تخیل بالکل یورپین واقع ہوئی تھی اس لئے وُہ حقیقی معنی میں ہندوستانی معاشرت سے متنفّر تھا اور مغربی زندگی کے لئے بیتاب رہا کرتا تھا۔ اس کی گفتگو اس کی نشست و برخاست، اس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا ہنسنا بولنا، الغرض اس کی زندگی کا ہر لمحہ یورپین تھا۔ وُہ سوچتا بھی تھا تو مغربی انداز میں اور خواب بھی دیکھتا تھا بالکل انگریزی وضع کا، لیکن ابد قسمتی سے اس کی مالی حالت اچھّی نہ تھی۔ اس لئے عملاً وُہ کسی طرح یورپین نہ بن سکتا تھا۔ اور اس حسرت میں رات دن تڑپا کرتا تھا۔

جب کبھی وُہ مال روڈ پر نکل جاتا اور وہاں کسی یورپین کو اپنی بیوی کے ساتھ آزادی سے سڑک پر تفریح کرتے دیکھتا تو گھنٹوں طامعانہ نگاہ سے انہیں دیکھا کرتا اور سوچتا کہ کیا میں اس زندگی کا اہل نہ تھا۔ کیا فطرت

بھی آباد ہو جاتا، ورنہ یوں ہی ویران و سنسان پڑا رہتا۔

سعید کی شادی باپ کی زندگی میں ہو چکی تھی۔ اور اس کی بیوی جو ایک غریب مگر نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھی بے انتہا مطیع و فرمانبردار خاتون تھی، شادی کے دوسرے سال ایک لڑکی بھی ہو گئی تھی۔ جسے سعید اپنی انتہائی بدقسمتی سے تعبیر کیا کرتا تھا۔

اس کی بیوی کے اعزّا میں سوائے ایک بھائی کے جو کسی دفتر میں بیس روپیہ کا ملازم تھا، اور ایک ضعیف ماں کے جو اپنے بیٹے کے ساتھ رہا کرتی تھی اور کوئی نہ تھا۔ سعید اکیلا تھا۔ اور اس کے ددھیال یا ننھیال میں اب کوئی شخص باقی نہ رہا تھا۔

شادی ہونے کے چند دن بعد تک تو کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہوئی جس سے سعید کی مسرّت یا عدم مسرّت کا پتہ چلتا۔ لیکن چھ ماہ گزر جانے کے بعد اس کے احباب وغیرہ پر حقیقت روشن ہو گئی کہ سعید اس شادی سے خوش نہیں ہے اور تنہا زندگی بسر کرنے میں اس کے لئے زیادہ مسرّت ہے۔ اتّفاق سے اس زمانہ میں تعلّقِ ملازمت کے سلسلہ سے لکھنؤ جانا پڑا۔ اور اس کی بیوی حمیدہ اپنے بھائی کے گھر اُٹھ گئی۔ وہ خیال کرتی تھی کہ ایک آدھ

اس قدر بخیل ہے کہ وہ میرے لئے یہ آسانیاں فراہم نہیں کر سکتی۔

اثنا میں بھی جب کبھی وہ اسٹیشن پر چلا جاتا اور ٹرین میں کسی انگریز یا میم کو دیکھ لیتا تو ہفتوں اپنی بیوی سے بات نہ کرتا۔ گویا وہ اس بات پر برہم ہوتا تھا کہ وہ بھی کیوں ایسی ہی نہیں ہو جاتی۔ اس کی حیات کا نصب العین یہ تھا کہ آبادی سے دور صاف ستھرے بنگلے میں کسی تعلیم یافتہ حسین خاتون کے ساتھ آزادی کی زندگی بسر کرے، ایک موٹر پر شام کے وقت اس کے ساتھ تفریح کو نکلا کرے۔ اور لوگ اس کو دیکھ کر بالکل اسی طرح رشک کیا کریں جس طرح اب وہ دوسروں پر کرتا ہے۔

(۲)

سعید کو لکھنؤ گئے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور اس دوران میں اس نے سوائے دو خطوں کے جن میں اپنے مکان کے انتظام کے متعلق کچھ ہدایات درج تھیں اور کوئی خط نہیں بھیجا۔ غریب حمیدہ نے متعدد بار اُسے توجہ دلائی کہ اگر لکھنؤ لے جانا ممکن نہیں ہے تو کم از کم دس روپیہ ماہوار تو بھیج دیا کرے لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چونکہ حمیدہ کا بھائی خود غریب تھا۔ اس لئے وہ اپنا اور اپنی لڑکی کا بار اس پر کس طرح ڈال سکتی تھی۔ مجبوراً اُس

سلائی کا کام شروع کر دیا۔ چونکہ وُہ اس کام میں مشتاق نہ تھی اس لئے پانچ، چھ آنے روز حاصل کرنے کے لئے بھی لمبا اوقات اُسے آدھی آدھی رات تک کام کرنا پڑتا۔ پھر اپنی معصوم بچّی کی خدمت کرنا، اس کے کپڑے دھونا، کھانا پکانا، اس کے علاوہ تھا۔ لیکن وُہ حد درجہ صبر وشکر کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کر رہی تھی اور اپنے شوہر کی آبرو کو سنبھالے ہوئے ایک کونہ میں بیٹھی تھی۔

اُس طرف سعید کا یہ حال تھا کہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد احباب جمع ہو جاتے اور مختلف مشاغل تفریح میں اپنا وقت لبسر کیا کرتا۔ اس کو ایک سو روپیہ ماہوار ملتے تھے لیکن سب اپنے احباب پر صرف کر دیتا تھا۔ اس کے دفتر میں ایک عیسائی لڑکی مس روزا ٹائپ کا کام کرتی تھی۔ اس سے بھی سعید کے مراسم بہت بڑھ گئے اور شام کا کھانا اس کا سعید کے ہاں لازم ہو گیا۔

وُہ بعد عصر آتی اور دو چار گھنٹے سعید کا وقت مُسرت کے ساتھ بسر کرنے کے عوض میں رات کا کھانا اس کے ساتھ کھا کر چل دیتی۔ سعید کے حلقۂ احباب میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ مس روزا سعید کے ساتھ بہت اُلفت رکھتی ہے اور سعید تو اس کے متعلق یہ سمجھا کرتا تھا کہ شاید خدا کی مائدہ رحمت کا نزول

انہیں مجھے نصیب ہو۔"

روزا۔ "سعید! تم نے وُہ بات کہی جو مجھے کہنا چاہیئے تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب دُنیا میں اور کون ہو سکتا ہے کہ تم ایسا انسان مجھ سے محبت کرے۔ مَیں یقیناً تم کو اس کا کوئی عوض نہیں دے سکتی سوائے اُس ایک مجروح دل کے جس کے ایک ایک رگ میں تمہاری محبت روح بنی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ اگر تمہاری محبت و الفت کے جواب میں مَیں اپنی جان بھی دے دُوں تو بھی تمہارے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔"

سعید۔ "روزا! تم کیوں مجھے محجوب کرتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم سا وفاشعار، تم سا سچی محبت کرنے والا وجود ہزار میں کسی ایک کو شاید نصیب ہوتا ہو گا اور واقعہ ہے کہ اسی کے احساس نے مجھے تباہ کر رکھا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ اس مہینہ میں سارا انتظام کر لونگا۔ لیکن جس تاجر سے میرا لین دین ہے وُہ طاعون پھیل جانے کی وجہ سے دکان بند کر کے میرٹھ چلا گیا ہے اور اب صرف اس کی واپسی کا انتظار ہے۔"

سعید ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ دفعتاً اسے سردی محسوس ہوئی اور

ہوًا ہے۔

ظاہر ہے کہ سعید ایسے انسان کے لیئے ان حالات میں اپنی پردہ نشین بیوی یا اس کی بچیّ کا کیا خیال آسکتا تھا، لیسا اوقات اس کے جی میں آیا کر طلاق دے دے۔ لیکن خدا جانے کیوں اس پر عمل نہ کر سکا۔ اور ہمیشہ یہی کہہ کر ٹالتا رہا کہ اب کی مرتبہ اگر تقاضا کا کوئی خط آیا تو یقیناً وہ صاف صاف لکھ بھیجے گا۔

ان واقعات کو بھی چار مہینے گزر چکے ہیں اور یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ مس روزا کی شادی سعید سے ہوگی ابھی تک کوئی تاریخ مقرّر نہیں ہوئی اور نہ اس کی چنداں ضرورت سمجھی گئی۔ کیونکہ سعید کا سامان شادی تیار کر لینا گویا تاریخ کا مقرّر ہو جانا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ سعید اپنی آنے والی پُرمسرت زندگی کے خیال میں مست د سرشار بیٹھا ہوُا تھا مس روزا بھی نہایت ہی مسرور و شاداں قریب کی کرُسی پر بیٹھی ہوئی کسی خیال میں محو تھی۔

سعید۔ "روزا! بعض اوقات میں ایسا سمجھنے لگتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب خواب ہے اور میں کبھی ایسا خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ کہ تم ایسا

مس روزا سے معذرت کر کے اندر کمبل لینے چلا گیا۔ اندر پہنچتے پہنچتے لرزہ اس قدر شدّت سے طاری ہو گیا کہ وُہ باہر نہ آسکا اور وہیں اندر پلنگ پر پڑ رہا۔

دس پندرہ منٹ گزرنے کے بعد بھی جب سعید باہر نہ آیا تو مس روزا اُٹھی اور کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ سعید نے کانپتی ہوئی آواز سے اس کو اندر بلا لیا۔ لیکن جس وقت مس روزا نے دیکھا کہ سعید پر لرزہ طاری ہے اور تپ کی علامات اس کے چہرہ سے نمایاں ہیں تو گھبرا گئی اور بولی "سعید مجھے اجازت دو کہ کسی ڈاکٹر کو جا کر بلا لاؤں کیونکہ تمہیں تپ چڑھ آئی ہے اور اس کا علاج فوراً ہونا چاہیئے"۔

سعید "نہیں، آپ تکلیف نہ کیجئے۔ یوں ہی معمولی لرزہ چڑھ آیا ہے اور تھوڑی دیر میں پسینہ آ کر تپ بھی جاتی رہیگی"۔ (ہات بڑھا کر) دیکھئے پسینہ کی آمد شروع ہو گئی ہے"۔

روزا۔ (گھبرا کر) "نہیں میں کیا سمجھ سکتی ہوں۔ آپ تو فوراً اپنا ہات اندر کر لیجئے میں ابھی جا کر ڈاکٹر کو بلاتی ہوں"۔

سعید اُسے روکتا ہی رہا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی اور اپنی چھتری سنبھال کر باہر چلی گئی۔

مس روزا کو گئے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس عرصہ میں سعید کے اور احباب بھی آئے اور دیکھ دیکھ کے ڈر کے مارے چلے گئے۔ کیونکہ اب سعید کی تپ نہایت شدید ہو گئی تھی۔ اور ران میں گلٹی بھی نمودار ہو گئی تھی۔

سعید کا ایک نوکر تھا جو رات کو کھانا کھلا کر گھر چلا جاتا تھا اور صبح کو پھر آجاتا تھا۔ اس نے جو یہ حالت سعید کی دیکھی تو وہ بھی گھبرا گیا اور جلدی جلدی کاموں سے فارغ ہو کر آٹھ ہی بجے گھر چلا گیا۔ الغرض اب سعید بالکل تنہا تھا اور کوئی پانی دینے والا بھی اس کے پاس نہ تھا۔

جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ سعید کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو قریب قریب ہذیانی کیفیت اس پر طاری تھی اور شدت کرب سے بُری طرح کراہ رہا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے دفتر کا چپراسی کوئی ضروری کاغذ لے کر آیا تو اس نے سعید کو اس حالت میں پا کر سخت افسوس کیا اور چونکہ آدمی بڑا ہمدرد تھا۔ اسلئے اس نے ازراہِ ہمدردی کچھ وقت بھی اس کے پاس صرف کیا۔ سعید نے جو ساری رات تشنگی میں بسر کر چکا تھا چپراسی سے پانی مانگا اور پانی پینے کے

بعد جو کچھ حواس درست ہوئے تو اُس نے ایک تار لکھ کر اس کو دیا اور ایک روپیہ اور اس کے حقِ محنت کا زرِ دستی اس کو دے کر ہدایت کر دی کہ یہ تار ابھی جا کر دے دے۔

(۳)

جس وقت تار اناوہ پہنچا تو کسی اور پر کوئی اثر ہوا ہو یا نہ ہو۔ لیکن حمیدہ کا بُرا حال ہو گیا اور وُہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرنے لگی کہ کس طرح اس کے پر لگ جائیں اور وُہ اسی وقت اُڑ کر پہنچ جائے۔ ہر چند اس کے بھائی نے مخالفت کی کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا ہمدردی جو اپنے اہل و عیال کے لیے اس قدر ظالم ثابت ہُوا ہو۔ لیکن حمیدہ کسی طرح نہ مانی اور شام کی گاڑی سے اپنی بچّی محمودہ کو لے کر تنہا لکھنؤ چل دی۔

جس وقت حمیدہ سعید کے گھر پہنچی رات کے ۹ بج چکے تھے۔ محلّہ میں چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ اور سعید تنہا پلنگ پر بیہوش پڑا ہُوا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اُسے ہوش میں لایا جائے۔ ہات پاؤں سہلائے آوازیں دیں، ہات کے سہارے سے اُٹھا کر بٹھلانے کی کوشش کی لیکن سعید کو مطلق ہوش نہ آیا۔ تپ کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ دُور سے لپٹ محسوس

ہوتی تھی۔ اور کوئی اندرونی تکلیف ایسی تھی جس سے وُہ گھڑی گھڑی نہایت بھیانک کراہ نکالنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

حمیدہ زاروقطار روتی تھی۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رات کے وقت ایسی اجنبی جگہ اور اس حال میں کہ ایک پیسہ بھی اس کے پاس نہیں ہے کیا کرسکتی ہے۔ ہر طرف اُسے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی اور سوائے خدا کے بظاہر کوئی سہارا اُسے نہ دکھائی دیتا تھا۔

ایسی شدید مایوسی کی حالت میں ایک نوع کا سکون انسان پر طاری ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حمیدہ بھی اب اسی سکون کو محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے وضو کیا، نماز پڑھی اور غالباً اس کی عمر میں یہ پہلی نماز تھی جو صحیح معنی میں خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کی گئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وُہ سجدہ میں گر پڑی اور رو رو کر خدا سے سعید کے لئے دعائے صحت مانگنے لگی۔ کامل آدھ گھنٹہ تک وُہ اپنا سر بے تابانہ رگڑتی رہی، زاروقطار روتی رہی یہاں تک کہ اس کے آنسو خشک ہوگئے، ہچکیاں بندھ گئیں اور نڈھال ہو کر وہیں زمین پر گر پڑی۔ دس منٹ اسی حالت میں گزرے ہونگے کہ سعید کے منہ سے پانی کا لفظ نکلا اور وہ دوڑتی ہوئی گھڑے کے پاس گئی۔ وہ گلاس میں پانی انڈیل

رہی تھی کہ اس کی نگاہ ایک کاغذ کے پرزہ پر پڑی، چاندنی رات تھی، آسمان صاف تھا۔ اس نے جو غور کیا تو اُسے لفظ طاعون جلی قلم سے لکھا ہوا نظر آیا اُس نے کاغذ اُٹھا لیا اور سعید کو پانی پلانے کے بعد جو اُسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اخبار کا پُرزہ تھا جس میں کلکتہ کے ایک ڈاکٹر کا حال درج تھا کہ اس نے ٹنکچر آیوڈین کے ذریعہ سے بہت سے طاعون کے مریضوں کا کامیاب علاج کیا۔

ٹنکچر! ٹنکچر!! اس وقت کہاں مل سکتا ہے۔ حمیدہ نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا کہ شاید کسی شیشی میں رکھا ہو۔ کہیں کامیاب نہ ہوئی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ جس طرح ممکن ہوگا وہ ٹنکچر مہیا کریگی۔ چنانچہ اس نے برقعہ اوڑھا اور باہر کی زنجیر لگا کر باہر چل دی۔

رات کے دس بج چکے ہیں اور حمیدہ گلیوں سے گزرتی ہوئی، لوگوں سے راستہ پوچھتی ہوئی امین آباد پہنچتی ہے۔ لیکن یہاں پہنچکر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وُہ پھر گھبرا گئی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر سنبھلی اور سیدھی ایک ڈاکٹر کی دکان پر پہنچکر ایک تولہ ٹنکچر طلب کیا۔ کمپونڈر نے ایک شیشی میں ٹنکچر کا وزن کر کے دیا اور آٹھ

آنے قیمت طلب کی۔ حمیدہ نے ایک ہات سے شیشی کو اچھّی طرح مضبوط پکڑا۔ اور دوسرے ہات سے اپنی ناک کی لونگ جو ایک روپیہ سے زیادہ کی نہ ہوگی اور جو تنہا زیور اس کے جسم کا تھا، کمپونڈر کے حوالہ کی۔ اس نے وہ لونگ واپس کر دی اور کہا کہ مجھے تو آٹھ آنے چاہیئے۔ مَیں یہ لونگ لے کر کیا کروں گا۔

حمیدہ نے جواب دیا کہ "اگر یہ لونگ بیکار چیز ہے تو اسی بیکار چیز کے عوض مجھے یہ دوا دے دو۔ کیونکہ بہرحال یہ دوا مجھے لینا ہے اگر تم یوں نہ دوگے تو میں تم سے بھیک مانگوں گی اور لے جاؤنگی"۔ اس گفتگو کو ڈاکٹر اور دوسرے لوگوں نے بھی سُنا اور آخر کار یہ فیصلہ قرار پایا کہ لونگ اس خاتون کو واپس دے دی جائے اور دوا کے دام کل یا جب اُس کے پاس ہوں ادا کر دے۔

جب حمیدہ واپس آئی تو گیارہ بج چکے تھے۔ سعید بیہوش پڑا ہوا تھا۔ اور محمودہ بھی غافل سو رہی تھی لیکن رضائی جسم سے علیحدہ تھی۔ اُس نے چاہا کہ اس کو اچھّی طرح اڑھا کر سعید کی تیمارداری میں مصروف ہو لیکن جب وقت اس کے پاس پہنچی اور اس کے جسم میں ہات لگا تو معلوم ہُوا کہ اس کو بھی بخار آگیا ہے۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر ٹٹولا تو بائیں طرف گردن کے غدود بھی کچھ پھولے ہُوئے نظر آئے بجلی کسی درخت کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتی جو محمودہ کے

بخار نے اس وقت حمیدہ کے ساتھ کیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ہات پانوں ڈھیلے پڑ گئے۔ سر چکرانے لگا اور تنفس میں اس قدر تیزی پیدا ہو گئی گویا سانس اس کے سینے میں سماتی نہیں ہے وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کوئی نہایت بیدردی کے ساتھ اس کی رُوح نکال رہا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھے جا رہے ہیں۔ وہ اسی حال میں مبتلا تھی کہ سعید نے پھر گھبرا کر پانی مانگا۔ حمیدہ اس طرح چونک پڑی جس طرح کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے اور فوراً اٹھ کر گلاس میں پانی ڈالا اور اسی کے ساتھ دو قطرہ ٹنکچر کے ملا کر سعید کو پلا دیا۔

صبح تک سعید نے پندرہ بیس مرتبہ پانی مانگا اور حمیدہ نے ہر مرتبہ ٹنکچر ملا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے دست آنے لگے اور ۸ بجے دن تک اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن وہ ابھی تک کسی کو پہچانتا نہ تھا۔ ہذیان میں کبھی کبھی روتا۔ اقبال، مظفر وغیرہ کا نام لیتا تھا اور کچھ ٹوٹے ہوئے فقرے بھی ادا کرتا تھا۔

جُوں جُوں سعید کی حالت بہتر ہوتی جاتی تھی۔ حمیدہ کے سینے سے بوجھ کم ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ محمودہ کی بیماری اس کا دل بٹھائے دیتی تھی۔ اس نے اس کو بھی ٹنکچر کا استعمال شروع کرایا۔ لیکن کوئی فائدہ

محسوس نہ ہوا۔ اس کی تپ بڑھتی جاتی تھی اور گلٹی زیادہ نمودار ہو رہی تھی یہاں تک کہ جب شام کو سعید کے حواس مجتمع ہوئے اور اُس نے حمیدہ کو پہچانا تو محمودہ کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اب وہ اپنی ماں کو بھی نہ پہچان سکتی تھی۔

(۴)

گزشتہ واقعات کو ۳ ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ سعید اب صحیح و تندرست ہو کر دفتر پابندی کے ساتھ جانے لگا ہے۔ لیکن نہ اب مس روز سے اس کی ملاقات ہے اور نہ خود غرض احباب اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کی حالت بالکل بدل گئی ہے۔ اور وُہ اب متاہل زندگی کے برکات کا اس قدر قائل ہو گیا ہے کہ پہلے جن لوگوں کی زندگی پر وُہ رشک کیا کرتا تھا۔ اب اُن سے متنفر ہو گیا ہے۔

حمیدہ اس کے پاس ہے اور ہر چند محمودہ کی موت کا غم اس کے لئے موت فرسا ہے۔ لیکن جس وقت وُہ سوچتی ہے کہ محمودہ کو ہات سے دے کر اس نے اس سے زیادہ قیمتی چیز حاصل کر لی ہے تو اس کو سکون ہو جاتا ہے اور وُہ اس خیال سے خوش ہو جاتی ہے کہ سعید اب اس محبت

کو ٹھکراتا نہیں بلکہ عزّت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور غالباً ہندوستان کی عورت کیلئے دنیا میں اس سے زیادہ قیمتی دولت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کا شوہر اس سے محبّت کرنے والا ہو۔

(نگار، اپریل سنہ ۱۹۲۴)

# بلتا زار

اس زمانہ کا ذکر ہے جب بلتا زار، اٹیوپیا کا فرمانروا تھا۔ یہ تھا تو سیاہ فام مگر نقشہ اچھا تھا اور اس کے ساتھ دانشمند و کریم بھی تھا، اپنی حکومت کے تیسرے برس جب کہ اس کی عمر ۲۳ سال کی تھی، وہ ملکہ سبا (بلقیس) سے ملنے کے لئے روانہ ہوا، ایک مجوسی (سمبو بیتیس) اور ایک خواجہ سرا (منفرع) اس کے ہمرکاب تھے اور پچھتر اونٹ مُر، سونا اور ہاتھی دانت سے لدے ہوئے ساتھ ساتھ۔

راستہ میں مجوسی سیاروں کی تاثیرات اور پتھروں کے خواص اس کو بتاتا جاتا تھا اور خواجہ سرا مذہبی گانا سناتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ ان میں

سے کسی کی طرف متوجہ نہ تھا اور ان لومڑیوں کے تماشہ میں مصروف تھا جو کان اُٹھائے ہوئے ریت پر بیٹھی اسے نظر آتی تھیں۔

بارہ دن کے سفر کے بعد نسیم ملبا زار کے نشام تک گلاب کی خوشبو پہنچانے لگی اور شہر سبا نظر آیا۔ یہاں انہوں نے نوجوان لڑکیوں کو پھولوں سے لدے ہوئے انار کے درختوں کے نیچے رقص کرتے ہوئے دیکھا، تو مجوسی بولا کہ "رقص بھی عبادت کی ایک قسم ہے"۔

خواجہ سرا بولا کہ :-

"یقیناً یہ لڑکیاں نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہونگی"۔

جب شہر میں داخل ہوئے اور بڑی بڑی دکانیں، وسیع بازار، اسباب تجارت سے بھرے ہوئے دیکھے تو ان کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ انہیں آباد و ہنگامہ زا سڑکوں سے گزر رہے تھے، کہ دفعتہً انہیں سنگ خام کی بنی ہوئی ایک نہایت بلند دیوار نظر آئی جس پر متعدد طلائی قبے تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہی قصر بلقیس ہے۔

ملکہ بلقیس اس وقت ایک وسیع نشستگاہ میں تھی۔ جو سرو و معطر تھا۔ اور جس کے وسط میں فواروں کا پانی موتیوں کی صورت میں پھیل پھیل کر

گر رہا تھا، اور چھم چھم کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ بلقیس جواہر کار ملبوس میں وہیں کھڑی تھی۔ جب بلتا زار نے اُسے دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اس کو خواب سے زیادہ شیریں اور خواہش سے زیادہ حسین پایا۔

مجوسی نے آہستہ سے کان میں کہا کہ :۔

"اے میرے آقا اس سے ایک تجارتی معاہدہ ضرور کر لینا بھولنا نہیں"۔

خواجہ سرا بولا کہ :۔

"جہاں پناہ! ذرا ہشیار رہیے گا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ وُہ سحر سے کام لے کر مردوں کو اپنی محبّت میں مُبتلا کر لیتی ہے"۔

یہ کہہ کر دونوں نے بلتا زار کو سجدہ کیا اور لوٹ گئے۔

جب بلتا زار، بلقیس کے ساتھ تنہا رہ گیا تو اس نے گفتگو کی ابتدا کرنی چاہی لیکن وُہ قادر نہ ہُوا اور اپنے دل میں سوچا کہ کہیں اس سکوت سے غضبناک نہ ہو جائے۔

ملکہ مُسکرا رہی تھی اور اس حالت میں اس نے خود الیسی آواز سے جس کو بہترین موسیقی کہہ سکتے ہیں، اسلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"آپ کا آنا میرے لئے باعثِ فخر ہے آیئے اور میرے پاس بیٹھیے"۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنی انگلیوں سے (گویا کہ وُہ سفید نور کی شعاعیں تھیں) ارغوانی گدّوں کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر بچھے ہوئے تھے۔

بلنا زار بیٹھا، ایک طویل آہ بھری اور پھر دو تکیوں کو ہاتھ میں لے کر زور سے بھینچا کر :۔

"اے ملکہ اگر ان دونوں تکیوں سے بھی میں کوئی تیرا نافرمان دشمن ہو جائے تو میں اس طرح اس کی گردن مروڑ دوں"۔

یہ کہتا جا رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تکیہ میں سختی کے ساتھ گھُستے جا رہے تھے، یہاں تک کہ کپڑا تار تار ہو گیا اور اندر کے ریشے اُڑ کر ہوا میں پھیل گئے ایک آدھ ریشہ ملکہ کے رخسار تک بھی پہنچا اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

بلقیس بولی :۔

"اور کیوں تم میرے دشمنوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو؟"

"کیونکہ میں تم سے محبّت کرتا ہوں"۔

ملکہ بلقیس نے پوچھا :۔

"کیا آپ کے شہر میں کنوئیں کا پانی شیریں ہوتا ہے؟"

بلتازار حیرت زدہ ہو کر بولا "ہاں"۔

پھر وہ بولی کہ :۔

"مجھے یہ معلوم کرنے کا بڑا شوق ہے کہ ایتھوپیا میں خشک مربّہ کیونکر تیار ہوتا ہے"۔

بلتازار اور زیادہ متحیّر ہوا۔ لیکن بلقیس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ :۔

"ہاں ہاں میری خاطر سے بتاؤ"۔

بلتازار نے اپنے حافظہ پر زور دیا اور بیان کرنے لگا کہ مربّہ بنانے والے کس طرح بہی کو شہد میں پکاتے ہیں لیکن بلقیس نے کچھ نہیں سُنا اور دفعتہً قطع کلام کر کے بولی کہ :۔

تم تو ملکہ (کنداس) سے محبّت کرتے ہو، مجھے دھوکا نہ دو۔ کیا وُہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے"؟

بلتازار اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا کہ :۔

"اے ملکہ تجھ سے زیادہ خوبصورت، کیا یہ ممکن ہے"؟

لیکن ملکہ برابر ملکہ کنداس کی آنکھ، مُنہ، رنگ، گردن کے متعلق سوال

کرتی ہی، بلتازار نے اپنے بازو اس کی طرف بڑھائے اور بولا :-

"اے ملکہ وہ چھوٹا سا رکشیہ جو تیرے رخسار پر ہے مجھے لے لینے دے اور اس کے عوض میں مجھ سے میری نصف مملکت معہ مجوسی حکیم اور خواجہ سرا کے لے لے"

لیکن ملکہ بلقیس اُٹھ کھڑی ہوئی اور زور سے قہقہہ لگا کر دُور چلی گئی۔

جب مجوسی اور خواجہ سرا آئے تو انہوں نے بلتازار کو اس قدر پریشان پایا کہ اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا اور وُہ سمجھا کہ شاید معاہدہ تجارت کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

شام کو جب بلتازار نے ملکہ بلقیس کے ساتھ کھانا کھایا اور شراب استعمال کی تو بلقیس نے پھر اس سے پوچھا :-

"کیا یہ صحیح ہے ملکہ کنداس مجھ سے زیادہ حسین نہیں ہے؟"

بلتازار بولا :-

"ملکہ کنداس تو سیاہ فام ہے"

بلقیس نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولی :-

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سیاہ رنگ کا ہو اور فصیح نہ ہو"۔

"بلقیس! ......"

بلتا زار اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور اسکو اپنی آغوش میں لے کر پیشانی کو بوسہ دینا چاہا، لیکن اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ملکہ رو رہی ہے۔

بلتا زار نے پھر پوچھا:۔

"اے ملکہ تو کیوں رو رہی ہے، مجھ سے کہہ کہ تو کیا چاہتی ہے"؟

بلقیس نے رونا بند کیا تو دیر تک ساکت و متحیر رہی اور پھر بولی کہ :۔

"عرصہ دراز سے ایک نامعلوم خطرہ میں گھری ہوئی ہوں، لیکن وہ اب تک مجھ پر قابو نہیں پا سکا۔ کیونکہ سبا کے دیوتا اور یہاں کی آبادی میری حفاظت کرتی ہے، لیکن جہاں رات آئی خوف کی کپکپی میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میرے سر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

یہ کہہ کر اُس نے بلتا زار کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا کہ :۔

"آؤ شہر میں بھیس بدل کر چلیں"۔

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے پاس آئی اور سامنے کے میدان کو دیکھ کر بلتا زار سے بولی کہ :۔

"محل کی دیوار کے نیچے ایک فقیر سو رہا ہے، تم جاؤ اپنے کپڑے اس کے حوالہ کرو، اور اس کا موٹا لباس اور اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا عمامہ پہن لو اور جلدی کرو۔"

یہ کہہ کر وُہ کھانے کے کمرہ سے چلی گئی اور بلتازار نے اپنا زر کار لباس اُتار کر فقیر کے کپڑے پہن لئے۔ اتنے ہی میں بلقیس بھی آگئی اس حال میں کہ وہ نیلے رنگ کی بغیر سلی ہوئی چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور بولی کہ "آؤ۔"

(۲)

رات تاریک تھی اور بلقیس اس کے اندر روشن تارہ کی طرح چمک رہی تھی۔ بلتازار کو ساتھ لئے ہوئے چلی اور ایک شراب خانہ میں پہنچی جہاں بازاری لوگ اور فاحشہ عورتیں نظر آرہی تھیں۔ یہاں یہ دونوں ایک کونہ میں بیٹھ گئے اور دیکھا کہ کہیں کچھ بد معاش کسی عورت یا شراب کے لئے آپس میں لڑ رہے ہیں اور کہیں بعض لوگ خمار میں فرش پر پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کی ہوا بہت کثیف تھی اور سخت بُو آرہی تھی۔

بلقیس نے دیکھا کہ مچھلیوں کے ٹکڑے چھت میں لٹکے ہوئے ہیں

اور اُس نے بلتا زار سے کہا:۔

"میں ایک مچھلی کُتری ہوئی پیاز کے ساتھ کھانا چاہتی ہوں"۔

بلتا زار نے خادم کو لانے کا حکم دیا، لیکن جب بلقیس کھا چکی تو بلتا زار کو خیال ہوا کہ وہ اپنے ساتھ روپیہ تو لایا ہی نہیں، پھر اُس نے سوچا کہ "بغیر دام ادا کئے ہوئے میں یہاں سے نکل جاؤنگا"۔ مگر جب اس نے ایسا ارادہ کیا تو مالک دوکان نے راستہ روک لیا اور دونوں کو گالیاں دینے لگا۔

بلتا زار کو غصّہ آیا اور گھونسہ مار کر اس کو زمین پر گرا دیا، اب تنرا ہوں کو ذرا ہوش آیا تو چھریاں لے کر دوڑ پڑے۔ لیکن اتفاق سے بلتا زار کو پیاز کوٹنے کی بڑی موگری مل گئی، اور اُس نے اس کی ضرب سے دو کو وہیں گرا دیا۔ باقی چھُپ گئے، بلقیس اس اثنا میں برابر بلتا زار کے پہلو سے لگی رہی اور اپنے جسم کی حرارت سے بلتا زار میں جوش پیدا کرتی رہی۔

اب لوگوں نے دُور ہی سے اس پر حملہ شروع کر دیا اور پیالے، ہانڈیاں، شمعیں جو کچھ بھی ہاتھ آیا پھینک کر مارنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک نے شراب کا بڑا بھرا ہوا دیگ بلتا زار کے سر پر پھینک کر مارا جس سے اس کو سخت صدمہ پہنچا۔

اب بلتا زار نے نجات اسی میں دیکھی کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ چنانچہ اس نے بلقیس کو اپنی آغوش میں لیا اور تنگ و تاریک راستوں میں ہو کر بھاگ گیا، کچھ دیر تک تو تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آواز آتی رہی لیکن بعد کو سناٹا ہو گیا اور کوئی آواز بلقیس کو نہ سنائی دیتی تھی، سوائے ان قطرات خون کے جو بلتا زار کی پیشانی سے اُس کی گردن پر گر رہے تھے۔

ملکہ بولی :۔ "میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔"

اب بادلوں سے چاند نکلا اور بلتا زار نے بلقیس کی آنکھوں میں ایک مشتعل سپید نُور دیکھا جو اس کی لانبی پلکوں کے اندر سے جگمگا رہا تھا۔ بلتا زار ایک خشک حوض کی نالی کے اندر سے لڑکھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ کہ اس کا قدم پھسلا اور دونوں ہم آغوش وہیں گھاس پر گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔

اتّفاق سے اسی وقت ایک جماعت قزاقوں کی اُدھر سے گزری اور ان کو دیکھ کر بولی کہ "ہر چند یہ دونوں فقیر ہیں لیکن ہیں جوان و حسین، اس لئے دام اچھے مل جائیں گے۔"

چنانچہ اُنہوں نے ان دونوں کو رسّی سے باندھ کر گدھے کی پیٹھ پر کس دیا اور روانہ ہوگئے۔ جب بلتازار کو ہوش آیا اور اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا تو لگا قزاقوں کو ڈرانے دھمکانے مگر اُنہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔

دونوں اسی حال میں جا رہے تھے، کہ صبح ہوئی اور آفتاب جوں جوں بلند ہونے لگا گرمی بڑھنی گئی۔ آخر کار دوپہر کو قزاقوں نے اپنا ڈیرا کھولا ان کو بھی ایک چٹان کے سایہ میں بٹھا دیا اور سڑی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ان کے سامنے ڈال دیا، بلقیس نے اس کو اُٹھا لیا اور ہنسنے لگی، قزاقوں کے سردار نے ہنسی کا سبب دریافت کیا تو بولی کہ:۔

"مَیں اس لئے ہنس رہی ہُوں کہ بہت جلد تم سب کو پھانسی پر چڑھائے جانے کا حکم دینے والی ہوں"۔

سردار بولا:۔

"تجھ ایسی عورت کے مُنہ سے جس کا کام صرف برتن دھونا ہے، ایسی گفتگو بہت عجیب ہے، شاید تو اپنے اس سیاہ فام رفیق پر اعتماد کرتی ہوگی اور یہی تیرے حکم کی تعمیل میں ہم لوگوں کی گردن مارے گا"۔

بلتازار کو بلقیس کی ایسی توہین گوارا نہ ہوئی اور اس نے جھپٹ کر قزاق کی گردن پکڑ کر گلا گھونٹنا شروع کیا۔ لیکن قزاق نے بلتازار کے پیٹ میں چھری بھونک دی اور وہیں ایک نظر یاس بلقیس پر ڈالتا ہوا گر پڑا۔

(۳)

اسی وقت سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور بلقیس فوراً پہچان گئی کہ اس کا سردار (انبیر) مجھے ڈھونڈنے آیا ہے۔

سردار نے بلقیس کے قدموں کے پاس تین بار سجدہ کیا اور پھر ہودہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی اس دوران میں قزاقوں کو پکڑ رہے تھے۔ ملکہ نے قزاقوں کے سردار کو دیکھا اور بولی کہ اب شاید تم یہ نہ کہہ سکو گے کہ میرا تمہارے پھانسی دیئے جانے کے متعلق ہذیان تھا۔

جب مجوسی حکیم اور خواجہ سرا نے اپنے مالک کو زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا دیکھا تو گھبرا کر دوڑ پڑے۔ چونکہ مجوسی فن طب میں حاذق تھا۔ اس لئے فوراً بادشاہ کو دیکھا اور یہ معلوم کر کے کہ ابھی کچھ اس میں حیات باقی ہے مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ جب اس سے فارغ ہو گیا تو ایک گھوڑے کی

پیٹھ پر رکھ کر اس کو بھی لے چلے اور قصرِ بلقیس تک پہنچ گئے۔

بلتا زار پندرہ دن تک ہذیان کے عالم میں رہا، سولھویں دن آنکھ کھولی تو اپنے پاس مجوسی اور خواجہ سرا کو دیکھا ملکہ کو وہاں موجود نہ پاکر اس نے گھبرا کر پوچھا کہ "وہ کہاں ہے"؟

خواجہ سرا بولا کہ "شاہ کوماچین کے ساتھ تخلیہ میں ہے"۔

مجوسی نے کہا۔ "یقیناً وُہ دونوں اسبابِ تجارت کے تبادلہ کا معاملہ کر رہے ہونگے"۔

بلتا زار بولا کہ "میں اسی وقت ملکہ سے ملنا چاہتا ہوں"۔

یہ کہا اور خود چل کھڑا ہُوا اور جب ملکہ کی خوابگاہ کے قریب پہنچا تو وہاں سے شاہ کوماچین کو نکلتے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور سونے کے ذرّات اس کے لباس پر چمک رہے تھے۔

بلقیس سرخ ریشمی بستر پر دراز تھی اور مُسکرا رہی تھی۔

بلتا زار بولا :۔

"اے بلقیس اے میری راحتِ روح!"

لیکن اس نے کوئی التفات نہیں کیا۔ اور اس طرح پڑی رہی

جیسے کوئی تلقبیس خواب دیکھ رہی ہے۔ بلتا زار آگے بڑھا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن ملکہ نے نفرت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی :-

"تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

بلتا زار نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سوال تو مجھ سے کرتی ہے؟"

بلتا زار نے محسوس کیا کہ بلقیس کی آنکھوں سے بے رحمی برس رہی ہے، اور اس طرح دیکھ رہی ہے گویا گذشتہ واقعات کا اسے علم ہی نہیں ہے، بلتا زار نے اس رات کا واقعہ یاد دلایا لیکن اُس نے کچھ نہیں سنا اور بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کا نشہ ابھی باقی ہے یا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

بلتا زار مایوس ہو کر چیخ اُٹھا :-

"خواب! یہ سب کچھ خواب کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میرے جسم پر چھری کے یہ نشان بھی خواب کی باتیں ہیں۔"

یہ سُن کر بلقیس اپنے ملبوس کے جواہرات چمکاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی :-

"انعقادِ مجلس کا وقت آگیا ہے اور اب مجھے فرصت نہیں کہ خواب کی

باتوں پر توجہ کروں، میں تم کو نصیحت کرتی ہوں کہ جا کر آرام کرو"۔

یہ سُن کر بلتازار نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے قویٰ جواب دے رہے ہیں۔ لیکن اس نے بہت ضبط سے کام لیا تاکہ اس قسی القلب عورت کے سامنے اس کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ لیکن جب بلقیس چلی گئی اور وہ اپنے حجرے میں پہنچا تو غش کھا کر گر پڑا اور زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔

(۴)

تین ہفتہ تک بلتازار بیہوش پڑا رہا۔ بائیسویں دن جا کر مشکل سے پھر اس میں آثارِ حیات پیدا ہوئے، اور اس نے آنکھیں کھول کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو بولا :۔

"اے حکیم دُنیا میں نیکی کا وجود نہیں ہے"؟

مجوسی نے جواب دیا :۔

"حکمت انسان کو نیک بنا سکتی ہے"۔

بلتازار نے کہا۔ "اچھا میں اسے حاصل کروں گا لیکن فی الحال تو اٹوپیا حاصل کرنا چاہیے"۔

---

بلنا زار گھنٹوں مجوسی حکیم اور خواجہ سرا کے پاس بیٹھا رہتا، اپنے قصر سے افق کے نخلستان کی ساکن شاخوں کو دیکھتا رہتا۔ ساحلِ نیل پر پڑے ہوئے گھڑیالوں پر چاند کی روشنی میں غور کیا کرتا۔

ایک رات مجوسی نے کہا:-

"انسان فطرت کے مطالعہ سے کبھی نہیں تھک سکتا"۔

بادشاہ بولا:-

"بیشک! لیکن فطرت میں درختوں اور گھڑیالوں سے زیادہ حسین چیزیں بھی شامل ہیں"۔ اس وقت اسے پھر بلقیس یاد آگئی تھی۔

مجوسی بولا:-

"اس دریائے نیل کے فیضان کے منظر کو دیکھو کس قدر عجیب ہے۔ جس کے اسباب کے ادراک کی مجھ کو توفیق عطا ہوئی ہے، کیا انسان فہم و ادراک کے لئے پیدا نہیں ہوا؟"

بادشاہ نے ایک آہ سرد بھر کر جواب دیا:-

"انسان تو محبت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ عالم میں بہت سی باتیں ہیں جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں"۔

مجوسی ۔ ”مثلاً؟“

بادشاہ ۔ ”عورت کی غیر وفاداری“۔

---

بلتازار نے مجوسی مسلک اختیار کر لیا، اور ایک بڑے برج کی تعمیر کا حکم دیا تاکہ اس کے اُوپر سے چاروں طرف کے ممالک اور فضاء آسمانی بالکل صاف نظر آئے۔ یہ برج دو سال میں تیار ہُوا اور بلتازار نے اپنے باپ کی ساری جمع کی ہوئی دولت اس پر صرف کر دی۔

اب مجوسی نے اس کو علم نجوم کی تعلیم شروع کی، چنانچہ بادشاہ کو لے کر وُہ ہر رات اس برج پر چڑھ جاتا اور بتاتا کہ یہ کواکب قبہ فلک میں جڑے ہُوئے ہیں۔ ان میں سے بعض مرد ہیں بعض عورت اور ان سے وُہ رموز وابستہ ہیں جن سے ہمیں اپنے مقدرات کے خیر و شر کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

بلتازار کہتا۔ ”یہ سب صحیح ہے لیکن مجھے تو تم ایسے علوم سے آگاہ کرو جس سے میرا دل بلقیس سے بھر جائے“۔

چنانچہ مجوسی نے اسے حکمت کی طرف توجہ دلائی یہاں تک کہ بلقیس

کا خیال اس کے دل سے نکل گیا۔ جب خواجہ سرا کو یہ معلوم ہُوا تو بہت خوش ہُوا اور اپنے مالک سے ایک دن کہا کہ :۔

"اے میرے مالک کیا تجھے معلوم ہے کہ ملکہ بلقیس کے پاؤں بکری کی طرح ہیں"؟

بادشاہ نے پوچھا "یہ مہمل بات تجھ سے کس نے کہی"؟

اس نے جواب دیا کہ "ملک سبا اور ایتھوپیا میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ بلقیس کی پنڈلیوں پر بال ہیں اور اس کے قدم کھُر کی طرح ہیں"۔

یہ سن کر بلتازار کو تکلیف ہوئی کیونکہ وُہ جانتا تھا کہ بلقیس کے پاؤں کس قدر حسین ہیں اور اس کو وُہ وقت یاد آ گیا جب وہ اس سے محبّت کرتا تھا، لیکن یہ خیال کر کے کہ جس سے اس نے محبّت کی تھی وُہ لوگوں کے خیال میں کس قدر مسخ شدہ ہے۔ اس کو فی الجملہ ترکِ محبّت پر افسوس نہیں ہُوا اور پھر علم و حکمت کے سیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

بلتازار نے علم سحر و نجوم اس قدر جلد حاصل کیا کہ وُہ نہایت آسانی سے بڑے بڑے احکام نافذ کرنے لگا، ایک دن اس نے اپنے اُستاد سے کہا :۔

"مَیں تیرے سر کی قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ میری ایک اطلاع بالکل صحیح ہے۔"

اُس نے جواب دیا:۔

"بیشک علم نجوم غلطی سے پاک ہے لیکن اس کے جاننے والے ہمیشہ غلطی کیا کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔"اگر سماوی حقیقتیں ہم سے ہمیشہ مستتر رہنے والی ہیں تو ہمارا ان کی جستجو میں سر کھپانا بیکار ہے، مَیں نے ایک نیا ستارہ دیکھا ہے جو بہت حسین ہے، اور وُہ مجھ سے یہ کہتا ہُوا معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی اس کے طالع میں پیدا ہُوا ہے، وُہ بڑا ہی خوش نصیب ہے، آؤ میں تمہیں وُہ ستارہ دکھاؤں"۔

لیکن مجوسی نے وُہ تارا نہیں دیکھا یا نہیں دیکھنا چاہا، کیونکہ وُہ پرانے لوگوں کی عادت کے مطابق نئی چیز کو پسند نہیں کرتا تھا۔

رات کی تاریکی میں جب کہ بلتازار تنہا تھا اُس نے پھر اپنے دل میں کہا کہ:۔

"کیسا خوش نصیب ہے وُہ بچہّ جو اس ستارہ کے طالع میں پیدا ہو۔"

(۵)

سارے اٹوپیا اور قرب وجوار کے ممالک میں یہ خبر عام ہوگئی کہ بلتازار کو بلقیس سے محبّت نہیں رہی، جب یہ خبر ملکہ سبا کو پہنچی تو وہ بہت برہم ہوئی اور اُس نے ایسا محسوس کیا کہ بلتازار نے اس کی خیانت کی ہے۔ وہ دوڑی ہوئی شاہ کوما جین کے پاس گئی (جو تمام اپنے ملک کے انتظامات کو خاک میں ملا کر یہیں پڑا ہوا تھا) اور اس سے بولی کہ "اور بھی کچھ تم نے سُنا، بلتازار نے میری محبّت ترک کر دی ہے۔"

اس نے کہا کہ "جب تک ہماری تمہاری محبّت قائم ہے۔ اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔"

بلقیس بولی کہ "یہ سب کچھ صحیح سہی لیکن اس سیاہ فام نے جو میری اہانت کی ہے اس کو کیونکر برداشت کر سکتی ہوں۔"

چنانچہ بلقیس نے اپنی سپاہ کو اٹوپیا چلنے کا حکم دیا اور کہا کہ "میں نے آج شام کو سفر شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس لئے غروب آفتاب تک تمام سامان درست ہو جانا چاہیے۔"

بلتازار برج پر ایک رات بیٹھا اس نئے ستارہ کا نظّارہ کر رہا تھا کہ

صحرا میں دُور اسے ایک سیاہ سادہ دھاگہ نظر آیا۔ لیکن دیر کے بعد یہ دھاگہ زیادہ روشن ہونے لگا اور رفتہ رفتہ کچھ گھوڑے، اونٹ، ہاتھی نظر آئے۔ آخر کار یلتازار کو معلوم ہو گیا کہ یہ ملکہ سبا کا باڈی گارڈ ہے۔ اس کے بعد اس نے خود ملکہ سبا کو بھی دیکھا جس سے اس کے دل میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا پھر از سرِ نو اس کی محبت میں گرفتار ہو جانے لگا۔ لیکن اسی وقت جب کہ نیچے ملکہ بلقیس اپنے مطلّا ہودہ میں جواہر کار لباس پہنے ہوئے جگمگا رہی تھی، اوپر وُہ نیا ستارہ چمک رہا تھا۔

جب بلتازار نے اُوپر نگاہ کی تو ستارہ نے اس سے گفتگو کی:۔

"سلامتی ہے اس شخص کے لئے جو اپنے عزم میں استوار رہا، اے شاہِ بلتازار ایک صاع مُر لے کر میرے ساتھ ہو جا تاکہ مَیں تجھے اس بچّہ کے قدموں تک پہنچا دوں جو اس ساعت میں درندوں کے درمیان میں پیدا ہُوا ہے، یہ بچّہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تجھے اپنے پاس بلاتا ہے۔ چونکہ تو نے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اس لئے وُہ تجھے امن وسکون دینے کے لئے طلب کر رہا ہے، وُہ تجھ سے کہے گا کہ فقیر ہو جا کیونکہ یہی حق کی دولت ہے، وُہ تجھ سے کہے گا کہ سچّی فرحت، خوشی کے ترک کر دینے میں ہے، وُہ

تجھے بتلائے گا کہ سوائے اس کے اور کوئی محبت کے قابل نہیں ہے۔"

ان کلمات سے بلتازار بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ وہ انسانیت کا دورِ جدید شروع کرنے والا ہے۔

تھوڑی دیر تک ملقبیس منتظر رہی لیکن جب اس نے دیکھ لیا کہ بلتازار کے اس قلب میں جہاں عبادت نے اپنا گھر بنالیا ہے، اس کی محبت نہیں سما سکتی تو سخت برہم ہوئی اور اپنے ساتھیوں کو فوراً واپسی کا حکم دیا۔

پھر بادشاہ معہ اپنے رفیقوں کے برج سے اُترا اور ایک جلوس مرتب کر روانہ ہوگئے، یہ دنوں تک سفر کرتے رہے، اس حال میں کہ وہی ستارہ ان کے آگے آگے رہبری کرتا جاتا تھا، راستہ میں اور بہت سے مجوسی بادشاہ ملے جن کی رہبری بھی یہی ستارہ کر رہا تھا، یہ سب کے سب سفر کرتے رہے حتیٰ کہ وہ ستارہ ٹھہر گیا اور سب نے جان لیا کہ وہ لڑکا اسی جگہ ہے۔

جب یہ ایک گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے مریم کے حجرہ میں ایک بچہ پایا جس کے سامنے یہ لوگ سربسجود ہوگئے اور اس کے سامنے مُر، سونا، اور لوبان پیش کیا جیسا کہ انجیل میں مذکور ہے۔

(اناتول فرانس)

(نگار، دسمبر ۱۹۲۵ء)

# نفسیاتی عذاب

برسوں گزرے کہ ایک شام اسپین کا محتسب اعظم پادری آربز (جو ڈومی نیکنیس[1] جماعت کا صدر تھا) زیر زمین قید خانے جانے والی لمبی سرنگ سے گزر رہا تھا۔ اس کے آگے دو پادری سیاہ عبائیں پہنے مشعلیں ہاتھ میں لیے ہوئے چل رہے تھے۔ سرنگ سے گزر کر وہ قید خانے کے دروازہ پر پہنچے اور زنجیر کھول کر ایک کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئے۔ مشعلوں کی

---

[1] یہ فرقہ ایک کیتھولک عیسائی پادری ڈامینک نے ۱۲۱۵ء میں قائم کیا تھا۔ اس فرقہ کا مقصد تبلیغ عیسائیت اور جو عیسائی مذہب سے منحرف ہو رہے تھے ان کے ایمانوں کو درست کرنا تھا۔ اس کے مقلدین نے اسپین کے غیر کیتھولک عیسائیوں اور غیر عیسائیوں خصوصاً مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے میں غیر معمولی بربریت اور بہیمیت سے کام لیا۔

دھیمی دھیمی روشنی میں انہوں نے دیواروں سے لٹکتی ہوئی بھاری آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک قیدی کو پھوس کے ڈھیر پر پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے گلے میں لوہے کا ایک طوق تھا جو ایک زنجیر سے جڑا ہوا تھا۔ پاؤں میں بھاری بیڑیاں تھیں اور کپڑے کی جگہ جسم پر چند چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ یہ قیدی سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ ممکن نہ تھا۔

یہ قیدی علاقہ اراکان کا یہودی برلی بر ہائیل تھا۔ اس کو کسی جرم میں اس زمین دوز تہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس حالت میں اس کو آج پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ اس کے یہاں روزانہ سخت سے سخت جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی۔ مگر وہ سخت جان اپنا دینِ آبائی ترک کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

وہ اپنی قدیم نسلی برتری پر نازاں تھا۔ وہ اپنی رگوں میں دوڑنے والے یہودی خون پر فخر کرتا تھا۔ اسے ناز تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے آخری جج ایشنبل کی اولاد تھا۔ اور یہی جذبہ فخر و مباہات تھا جس نے باوجود مسلسل اذیت و عقوبت کے اس کے استقلال میں فرق نہ آنے دیا

اور بڑا آہستہ آہستہ اُس لرزتے ہُوئے ربی (یہودی عالم دین) کے پاس گیا اور بولا:۔ "میرے بیٹے، خوش ہو جا کہ اب تیرے مصائب ختم ہونے والے ہیں۔ تیری ضد کی وجہ سے مجھے نہایت گراں خاطری سے تیرے ساتھ سختی کرنے کی اجازت دینا پڑی تھی۔ لیکن یہ سختی اب اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ تو انجیر کے اُس درخت کی طرح ہے جو مسلسل کوششوں کے باوجود بارآور نہ ہوسکا اور آخر کار سُوکھ گیا۔ اب تیری رُوح کو سزا دینے والا وہی قادرِ مطلق ہے جو ممکن ہے کہ تیرے آخری لمحات میں رحم و کرم سے کام لے۔ پس اس رات تو اطمینان اور سکون کی نیند سو۔ کل صبح عدالتِ احتساب کے اجلاس میں تیرا فیصلہ سُنا یا جائیگا۔ یعنی تو اُس آگ کی نذر کر دیا جائیگا۔ جو ازلی و ابدی آگ کی علامت کے طور پر یہاں روشن کی جاتی ہے بیٹے! تجھے معلوم ہے کہ مجرم آگ کے شعلوں میں ڈالا نہیں جاتا۔ بلکہ اُس کو بیچ میں کھڑا کر کے چاروں طرف آگ روشن کر دی جاتی ہے۔ اور موت کو آتے آتے عموماً دو تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم مجرم کے دل اور سر پر ٹھنڈے پانی کے پھائے رکھتے رہتے ہیں۔ تیرے ساتھ تینتالیس ۴۳ مجرم اور ہیں۔ تو سب سے آخری صف میں رہے گا اور اس لئے تجھے موقع ملے گا کہ تم آگ کا بپتسمہ

لینے سے پہلے تُو خداوند کی بھیجی ہوئی روشنی کو دیر تک دیکھ سکے"۔

یہ الفاظ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھیوں کو زنجیریں کھولنے کا اشارہ کیا اور مجرم کو نہایت محبّت سے گلے لگایا۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں نے اُن سختیوں کی معافی مانگی جو ان کی طرف سے ظاہر ہوئی تھیں اور پھر یہودی کے بوسے لیے۔ یہ رسم ادا کر کے وُہ قیدی کو تاریکی میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

ربی بَربانیل اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکایک اس کو ایک مبہم سا وہم پیدا ہُوا کہ اس نے دروازے اور دیوار کے درمیان ایک دراز دیکھی ہے جس سے مشعل کی روشنی کی ایک ہلکی سی کرن آ رہی ہے لیکن اسی ہلکی سی کرن نے اس کے بدن میں لرزش سی پیدا کر دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہُوا اس ناقابلِ یقین بات کی تصدیق کیلیے آگے بڑھا اور پھر نہایت احتیاط اور آہستگی سے دراز میں انگلی ڈال کر دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ حیرت اور خوشی کے مارے اس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ دروازہ اپنے قلابہ پر گھوم کر کُھل گیا تھا۔

بربانیل نے جھجکتے ہوئے باہر جھانکا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں

کے ہلکے سے عکس میں اس نے دیکھا کہ اس کی کوٹھڑی کے سامنے ایک چکردار زینہ ہے۔ چھ یا سات قدم اُوپر چڑھنے کے بعد دیوار میں ایسے ایک چھوٹا سا در نظر آیا جو ایک بہت لمبی سرنگ میں کُھلتا تھا جس کی محرابیں اس مدھم روشنی میں نظر آتی تھیں۔

وُہ آہستہ سے زمین پر اوندھا پڑ گیا اور کھسکتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے سے فاصلہ پر سرنگ کی چھت سے لٹکتے ہوئے چراغ، سُرنگ کی پژمُردہ فضا میں ہلکی سی روشنی کر رہے تھے۔ مگر اُس طویل سُرنگ میں کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف سرنگ کی بائیں جانب کی سنگی دیوار میں چند روشن دان بنے ہوئے تھے جن میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہُوئے سوُرج کی سُرخ کرنیں روشندان کی سلاخوں سے گزرتی ہوئی سرنگ کی زمین پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہاں خوفزدہ کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے سوچا کہ سرنگ کے دوسرے سرے پر دروازہ کا ہونا یقینی ہے۔ اس لئے وُہ اس دروازہ سے نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ یہودی کو اب اپنی کامیابی کی قوی اُمید پیدا ہو گئی تھی ـــ کیونکہ قید سے نجات کا یہی آخری موقعہ تھا۔

وُہ بلا کسی تامّل کے فرشِ زمین پر لیٹ گیا۔ اور روشندانوں کے نیچے بائیں جانب کی ننگی دیواروں سے ملا ہُوا ——— آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔ وُہ اپنے سینہ کے بل کھسک رہا تھا۔ کھسکتے وقت جب اس کا کوئی زخم چھِل جاتا تو وہ چیخ اُٹھنے پر مجبور ہو جاتا لیکن وُہ انتہائی ضبط سے کام لے کر اپنی بے ساختہ کراہ کو مُنہ سے نکلنے نہ دیتا۔

یکدم کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز اُس کے کانوں میں آنا شروع ہوئی۔ اس کے اُوپر ایک لرزہ طاری ہو گیا۔ سانس گُھٹنے لگی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ مگر یہ کیفیّت جلد ہی ختم ہو گئی۔ وہ ایک کونے میں دبک گیا اور نیم جاں حالت میں آنے والے خطرہ کا انتظار کرنے لگا۔

تیز قدموں کی ایسی آواز سے وُہ بہت مانوس تھا۔ محافظ سپاہی اپنے ہاتھ میں اذیّت والا ایک مہیب آلہ لئے ہوئے تیزی سے گزر گیا۔ امید و بیم کی اس کیفیت نے یہودی کے حواس معطل کر دیئے۔ اور وُہ بڑی دیر تک نیم بیہوشی کی حالت میں اُسی طرح پڑا رہا ——— پھر اُس اذیّت کے خیال سے جو پکڑے جانے پر دی جاتی اپنی کوٹھڑی کو واپس جانے کا ارادہ کرنے لگا مگر اُمید کی اس نازک کرن نے اُس کی ہمّت ٹوٹنے نہ دی۔ اس نے سوچا

یہ اتفاقیہ موقعہ ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اس لئے اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے

وُہ آہستہ آہستہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ روز کی عقوبت و اذیّت اور فاقہ کشی نے اس کی قوّت سلب کرلی تھی۔ زخموں کی شدید تکلیف سے وُہ کانپ رہا تھا، مگر پھر بھی وُہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے خانقاہ کی وُہ زمین دوز سرنگ پُراسرار طریقہ سے لا متناہی حد تک بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم وہ اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں بھاگنے کے راستہ کو تلاش کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اُس نے قدموں کی آہٹ سُنی۔ مگر اس بار یہ قدم بھاری اور سُست تھے۔ سرنگ کے دوسرے سرے کے دھندلکے سے سیاہ اور سفید کپڑوں میں ملبوس دو محتسب آتے ہوئے نظر آئے۔ وُہ نیچی آواز میں گفتگو کررہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی جنبش اور ان کی حرکات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ زیرِ غور معاملہ بہت اہم ہے۔

ان کو آتا دیکھ کر ربانیل نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی کہ اس کی سانس گھُٹنے لگی۔ خوف سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔ وہ دیوار سے چپکا ہوا بالکل ساکت پڑا رہا۔ اس کا منہ کھُلا ہوا تھا۔ اور

چھت سے لٹکتے ہوئے چراغ کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ وُہ خاموش پڑا ہوا۔ خداوند یہوداسے دعائیں کرتا رہا۔

بالکل اس کے برابر دونوں محتسب، چراغ کی روشنی کے نیچے رُک گئے۔ غالباً بحث کرتے کرتے وُہ کسی اہم نکتے پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک نہایت خاموشی وانہماک سے اپنے ساتھی کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بربانیل کی طرف تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وُہ اُسی کو دیکھ رہا ہے۔ مگر وُہ بدنصیب قیدی محتسب کے چہرہ پر جذبات کی یکسر عدم موجودگی کو پہلے دیکھ نہ سکا ــــ اور وُہ ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے دہکتے ہُوئے انگارے اور آگ کے شعلے اس کے گوشت کو پھر جلا رہے ہیں اور اس کا پورا جسم ایک بہت بڑا زخم بن گیا ہے۔ اس کی پلکیں کانپنے لگیں۔ سانس گھٹنے لگی۔ اس کے بدن پر لرزش سی طاری ہوگئی۔ اور وُہ بیہوش ہوگیا ــــ لیکن درحقیقت بات یہ تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کہ وُہ محتسب اپنے ساتھی کی باتیں سننے میں اس قدر غرق تھا کہ اس کا دماغ کسی دوسری چیز کا ادراک ہی نہ کر سکتا تھا۔ اور اگرچہ اس کی نظریں اُس یہودی پر پڑ رہی تھیں مگر وُہ اس کو دیکھ نہیں رہا تھا۔

وہاں چند منٹ ٹھہرنے کے بعد وہ دونوں سیاہ پوش شکلیں آہستہ آہستہ باتیں کرتی ہوئی وہاں سے اُسی طرف چلی گئیں۔ جدھر سے وہ قیدی آیا تھا۔ اب یہ یقین تھا کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ ربّی کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا میں بچا ہوں کہ اُن لوگوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ مگر ایک دہشت انگیز منظر نے اس کو اُس خواب کی سی کیفیت سے بیدار کر دیا۔ دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے پتھر کے پیچھے سے دو نہایت سُرخ آنکھیں اس کی طرف گھور رہی ہیں۔ لیکن یہ صرف واہمہ تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔

اُس نے نہایت عجلت سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ وُہ سمجھ رہا تھا کہ اپنے مقصود سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چند گز کے فاصلہ پر سرنگ میں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وُہ سمجھ رہا تھا کہ اس تاریکی میں اس کو نجات کا راستہ مل جائیگا۔ سینہ کے بل کھسکنے کی بجائے وُہ اب ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے جسم کے تمام زخموں کا انگور پھوٹ چکا تھا۔ ہر ہر حرکت اس کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث تھی۔ مگر وُہ پھر بھی تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ سرنگ کے تاریک حصّہ تک پہنچ گیا۔ اور وُہ

چند ہی گز آگے بڑھا تھا کہ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے ہاتھوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ ہوا سرنگ کے دروازے کے نیچے کی دراز سے آرہی تھی۔ کامیابی کی اُمیّد نے اس کے جسم میں ہیجانی کیفیّت پیدا کردی — اس کے دل میں بس ایک تمنّا تھی "کاش دروازہ کھُل جائے"۔ اس نے دروازہ کے ہر ہر حصّہ کو ہاتھ سے چھُو کر دیکھا۔ دروازہ میں کوئی زنجیر، کوئی تالا نہ تھا۔ وُہ صرف ایک زنجیر سے اٹکا ہُوا تھا۔ ہاتھ لگتے ہی دروازہ کا پٹ قلابہ پر گھُومتا ہُوا باہر کی طرف کھُل گیا۔ ربّی کے مُنہ سے مسرّت کی ایک چیخ نکل گئی۔ کامیابی کی خوشی نے اس پر ایک بیخودی طاری کردی تھی۔ اُسی کیفیت میں وُہ دہلیز پر کھڑا ہوگیا اور سامنے کے منظر پر ایک نظر ڈالی۔

دروازہ ایک باغ میں کھُلتا تھا۔ باغ سے ملے ہوئے ہرے بھرے کھیت بہت دُور تک پھیلے ہوتے تھے اور بہت دُور افق کے قریب پہاڑ کی بلند چوٹیوں کی قطار نظر آرہی تھی۔ آزادی، نجات اور مسرّت ہاتھ پھیلائے ہوئے اس سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ وُہ رات بھر اس باغ اور ان کھیتوں میں چلتا رہے گا اور صبح ہوتے ہوتے وُہ پہاڑ تک پہنچ جائیگا۔ جہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس نے اس تازہ اور خوشبودار ہوا میں ایک گہری سانس

لی اور تازہ سرد ہوا نے اس میں ایک نئی زندگی پھونک دی۔ خداوند یہوداکے اس رحم و کرم کا ایک مرتبہ اور شکر ادا کرنے کے لئے اُس نے ہوا میں اپنے ہاتھ بلند کئے اور آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھائیں کہ یکایک اس نے محسوس کیا کہ شاید اس کے ہاتھوں کے لمبے لمبے سائے اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور اس کو اپنے حلقہ میں لے لینا چاہتے ہیں اُس نے دیکھا کہ کوئی لمباسا آدمی اس کے سامنے کھڑا ہے۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں جسم میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور سانس رُکنے لگی۔ پادری اربز خود اُس کو اپنے ہاتھوں کے حلقے میں لئے کھڑا تھا اور نہایت رحم و شفقت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سیاہ پوش پادری نے مجبور و مایوس یہودی کو انتہائی محبت کے ساتھ پھر گلے سے لگایا۔ ربانیل انتہائی کرب کے عالم میں رُک رُک کر سانس لے رہا تھا اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ شام کے تمام واقعات محتسب اعظم ہی کے اشارہ کا نتیجہ تھے۔ اور یہ سب جان بوجھ کر اس لئے کیا گیا تھا کہ آگ میں ڈالنے سے پہلے اُسے آگ میں جلنے کی اذیت سے زیادہ اذیت پہنچائی جائے —— یعنی اُمید پیدا ہونے کے بعد مایوسی و ناکامی کی اذیت۔

محتسبِ اعظم نے مشفقانہ انداز میں مُسکراتے ہوئے کہا: "اے بیٹے، کیا نجات کے موقعہ پر تم ہم کو چھوڑ کر چلے جانا چاہتے تھے۔"

(ولیس ڈی لا اسل ڑدم)　　　(نگار نومبر ۱۹۴۵ء)

# سیاہ بلّی

میں جس عجیب و غریب وحشت خیز قصّہ کو بیان کرتے جا رہا ہوں اس کو نہ تو ہر ایک شخص یقین کریگا اور نہ میں اس کی امید کرتا ہوں، لیکن یہ قصّہ میرے تخیّل کی پیداوار نہیں، اور چونکہ کل میں اس دُنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اس لیئے اس واقعہ کو صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے بیان کر دینے سے میری رُوح کا بار کچھ ہلکا ہو جائے، میں دنیا کے سامنے اپنی گھریلو زندگی کے چند معمولی واقعات بیان کر رہا ہوں جو یکے بعد دیگرے کچھ اس نوعیّت و تسلسل کے ساتھ واقع ہوئے کہ میرے لیئے انتہائی رُوحانی و ذہنی کرب و تشنج کا سبب بن گئے مگر اتنا بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ یہ واقعات میرے

لیے انتہائی خوف و دہشت کا باعث ہوئے ہیں۔ مگر بہت ممکن ہے کہ دوسروں کو ان میں کوئی خاص اہمیت نظر نہ آتے۔

میں اپنے بچپن میں اپنی سیدھی سادھی اور عجز پسند طبیعت کے لئے مشہور تھا، میں اس قدر رحمدل واقع ہُوا تھا کہ میرے ساتھی اکثر میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے مجھے پالتو جانوروں کا شوق تھا اور میرے والدین نے میرے اس شوق کو پُورا کرنے کے لئے، میرے واسطے طرح طرح کے جانور پال رکھّے تھے، میرا زیادہ تر وقت انہیں جانوروں کے ساتھ گزرتا اور انتہائی سکون مسرّت کے ساتھ گزرتا، میری عمر کے ساتھ ساتھ میرا یہ شوق بھی بڑھتا رہا۔

جب میری شادی ہوگئی تو حُسنِ اتّفاق دیکھیئے کہ میری بیوی بھی اسی ذوق کی ثابت ہوئی جو میرا تھا۔ اس کو میری خوشنودی کا بہت خیال تھا، چنانچہ اس نے پالتو جانوروں سے میری دلچسپی دیکھ کر چند پسندیدہ جانور پال لئے۔ مختلف قسم کی خوبصورت خوش آواز چڑیاں، سنہرے رنگ کی مچھلیاں، چند نہایت عمدہ قسم کے کتّے اور انہیں کے ساتھ ایک سیاہ بلّی۔

یہ بلّی بہت خوبصورت تھی۔ رنگ بالکل سیاہ تھا۔ یہاں تک کہ جسم میں کسی دوسرے رنگ کا ایک نقطہ بھی نہ تھا اور سمجھ دار اتنی تھی کہ بعض اوقات اس پر

حیرت ہوتی تھی۔

میری بیوی تھوڑی سی توہم پرست واقع ہوئی تھیں۔ اس لئے وُہ کبھی کبھی باتوں ہی باتوں میں اشارۃً کہہ جاتیں کہ سیاہ بلّیاں اکثر جادوگرنیاں ہوسکتی ہیں۔ مگر پھر بھی وُہ اس خیال کو زیادہ اہمیّت نہ دیتی تھیں۔

مَیں نے بلّی کا نام پلوٹو رکھّا تھا، اور اس سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ مَیں خود ہی اس کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا اور اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا، وُہ بھی مجھ سے غیر معمولی طور پر دلچسپی رکھتی۔ مَیں جدھر بھی جاتا وُہ میرے پاؤں سے لگی رہتی۔ جب میں گھر سے باہر جانے لگتا تو اس کو بڑی دقّت سے الگ کرتا۔

ہماری یہ دوستی اور محبّت کئی سال اسطرح قائم رہی، اس عرصہ میں مجھے شراب کی لت ہوگئی (مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے) اور اس نے میری فطرت میں عجیب قسم کی تبدیلی پیدا کردی، مَیں کچھ اُداس سا رہنے لگا، میرے مزاج میں سختی اور تُرشی پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہوگیا کہ مجھے دوسرے کے جذبات واحساسات کا مطلق پاس ولحاظ نہ رہتا۔ یہاں تک کہ مَیں اپنی بیوی سے بھی نہایت درشت اور غیر مہذّب طریقے سے پیش آنے لگا۔

اور نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ میں نے اسے مارا بھی، اب پالتو جانوروں کے ساتھ بھی میرا سلوک بالکل مختلف ہوگیا۔ اور میں اکثر انہیں بھی زد و کوب کرنے لگا۔ کتّے یا دوسرے جانور اگر اتفاقاً سے یا اپنی محبّت کی بنا پر کبھی میرے پاس آ جاتے تو میں انہیں ضرور مارتا۔ مگر پھر بھی اس بلّی کے ساتھ میرا سلوک اتنا خراب نہ تھا۔ میں ایک حد تک اس کا ضرور خیال رکھتا، میری شراب خواری بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میری بد مزاجی بھی، یہاں تک کہ بلّی کو بھی میری درشت مزاجی کا پتہ چل گیا۔

ایک رات جب نشے کے عالم میں، شہر کی گلیوں کا "چکر" لگانے کے بعد گھر میں داخل ہوا تو میں نے محسوس کیا، کہ بلّی میرے پاس آنے سے گریز کر رہی ہے، میں نے بڑھ کر اسے بہت سختی سے دبوچ لیا۔ میرے اس غیر متوقع حملہ سے وہ خوفزدہ سی ہوگئی اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب میں اسی طرح اسے دبائے رہا تو اس نے مجھے کاٹ لیا۔ جس سے میرے ہاتھ پر ہلکا سا خراش آ گیا۔ اس کا کاٹنا تھا کہ میرے اُوپر غصّہ کا بھوت سوار ہوگیا۔ میں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکالا اور بلّی کی گردن مضبوطی سے پکڑلی تاکہ وہ سر نہ ہلا سکے اور اس کی ایک آنکھ کاٹ کر باہر نکال لی۔ (اب بھی

مجھے اس بہیمانہ حرکت کا خیال آتا ہے تو کانپ جاتا ہوں ؟

دوسرے دن صبح جب میں سو کر اٹھا تو نشہ اُتر چکا تھا عقل و ہوش پھر واپس آگئے تھے، رات کی اس حرکت کے خیال سے مجھ پر ایک دہشت و پشیمانی کی سی کیفیت طاری تھی۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی میں پھر شراب خوری میں مصروف ہو گیا اور اس واقعہ کا خیال بھی ذہن سے جاتا رہا۔ اس عرصہ میں بلّی بھی آہستہ آہستہ اچھّی ہو گئی اور اگرچہ اس کی آنکھ کی جگہ اب ایک غار نظر آتا تھا جو بہت بھیانک معلوم ہوتا، مگر اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی، وہ گھر میں آزادانہ گھوما کرتی، تاہم جب میری صورت دیکھتی تو خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتی۔ اگرچہ میرے احساسات مُردہ ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی جب میں یہ دیکھتا کہ وہ بلّی جو مجھ سے پہلے اتنی محبّت کرتی تھی، اب اس طرح مجھ سے گریزاں رہتی ہے، تو مجھے کچھ افسوس اور کچھ تکلیف سی ہوتی، مگر یہ احساس جلد ہی ختم ہو گیا اور اس کی جگہ مجھے اس کی اس حرکت پر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہونے لگی اور میرے اندر درندگی کی وہ کیفیت پیدا ہونے لگی جب کسی کو اذیت پہنچا کر خوشی محسوس ہوتی ہے اور جرم کے ارتکاب میں ایک خاص قسم کی لذّت محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک دن علی الصباح میں نے نہایت شقاوت سے اس بلّی کے

گلے میں ایک پھندا ڈالا اور اسے ایک درخت کی خشک شاخ سے لٹکا دیا — اگرچہ اس کو پھانسی دیتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اور میرا نفس مجھے ملامت کر رہا تھا، مگر پھر بھی میں اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔

جس دن مجھ سے یہ شقاوت ظاہر ہوئی اسی رات اتفاق سے میرے مکان میں آگ لگ گئی اور میری آنکھ اس وقت کھلی جب میرا بستر آگ پکڑ چکا تھا —— پورے مکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، میں اور میری بیوی اور خادمہ بہزار دقّت مکان سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے لیکن میرا تمام سامان جل کر خاک ہو چکا تھا، اس واقعہ سے مجھ پر قنوطیت چھا گئی اور میں اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہا۔

میں اُن کمزور دل کے لوگوں میں نہیں ہوں جو مصیبت کو کسی گزشتہ جرم کا بدلہ سمجھتے ہیں لیکن میں واقعات کی کسی کڑی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ آتشزدگی کے دوسرے دن میں اپنے جلے ہوئے مکان کو دیکھنے گیا۔ گھر کی تقریباً تمام دیواریں جل کر بیٹھ گئی تھیں۔ مگر ایک دیوار باقی تھی، میرے پلنگ کا سرہانہ اس دیوار کی طرف رہتا تھا، اس دیوار پر نیا پلاسٹر کرایا گیا تھا اور غالباً پلاسٹر کی نمی کی وجہ سے وہ دیوار آگ نہ پکڑ سکی تھی۔ اس دیوار

کے پاس لوگوں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا، اور لوگ اس کے ایک حصّہ کو بہت زیادہ غور سے دیکھ رہے تھے اور حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں بھی دیوار کے قریب گیا تو دیکھا کہ دیوار پر ایک بلّی کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اس کے گلے میں رسّی کا پھندا لٹک رہا ہے، تصویر اس قدر زیادہ صاف اور نمایاں تھی کہ اس کو دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی تھی۔

یہ تصویر دیکھ کر میں انتہائی خوفزدہ ہوا مگر جلد ہی میرے ذہن نے اس کی ایک تاویل کر لی جس سے مجھے کسی حد تک سکون ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے مکان سے ملحق ایک باغیچہ میں بلّی کو پھانسی دی تھی، آگ لگنے پر باغیچہ غالباً آدمیوں سے بھر گیا ہوگا، اور ان میں سے کسی نے بلّی کو درخت سے علیحدہ کر کے مجھے جگانے کے لئے میرے کمرہ کی کھڑکی سے اندر پھینک دیا، اور دوسری دیوار کے گر جانے سے وہ نئی پلاسٹر کی ہوئی دیوار اور ملبے کے بیچ میں دب گئی ہوگی اور دیوار کے چونے اور جلتی ہوئی لاش سے نکلے ہوئے امونیا نے بلّی کی وہ تصویر دیوار پر کھینچ دی ہوگی۔

ہر چند میں نے اس واقعہ کی عقلی تاویل تو کر لی مگر میرا ضمیر پوری طور پر مطمئن نہیں ہوا، اور یہ واقعہ میرے ذہن پر ایک گہرا اثر چھوڑ گیا، پلوٹو کا

وہی سایہ مہینوں مجھے پریشان کرتا رہا، اور اس عرصہ میں مجھ پر ایک پشیمانی کی سی کیفیت (جو حقیقت میں پشیمانی نہ تھی) طاری رہی، یہاں تک کہ مجھے اس بلّی کی جدائی کا افسوس ہونے لگا، اور میں اپنی آوارہ گردی میں بھی اکثر پلوٹو کی ہم شکل بلّی تلاش کرتا رہتا، تاکہ میں اس خلا کو پورا کرسکوں جو اس کے مرنے سے پیدا ہوگیا تھا --- ایک شب میں شراب خانہ میں مدہوش پڑا ہوا تھا کہ یکایک میری نظر ایک بلّی پر پڑی، جو شراب کے بڑے پیپے پر پیر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی، میں اُٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ ایک سیاہ بلّی تھی اتنی ہی بڑی جتنی کہ پلوٹو تھی، اس کی شکل بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پلوٹو کے جسم پر سیاہ رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ کا ایک بال بھی نہ تھا اور اس کے سینے پر سفید رنگ کا ایک بڑا دھبّہ موجود تھا میرے چھوتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔ آہستہ سے غرّائی اور پھر اپنا جسم میرے ہاتھ سے ملنے لگی۔

میں نے مالک مکان کو اس کی قیمت دینا چاہی مگر اس نے کہا کہ بلّی اس کی نہ تھی اور نہ اس سے پہلے اس نے کبھی اس کو اپنے مکان میں دیکھا تھا۔

میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور جب میں وہاں سے گھر چلنے لگا تو وہ کچھ اس طرح سے پیش آئی کہ گویا وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا، میرے گھر سے یہ بہت جلد مانوس ہوگئی اور میری بیوی کو تو اس سے خاص اُنس پیدا ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے اس سے بھی نفرت پیدا ہوگئی اور میں اس سے الگ رہنا چاہتا۔ بعض اوقات جسمانی اذیت پہنچانا چاہتا، مگر اس لئے باز رہتا کہ مجھے اپنی پچھلی وحشیانہ حرکت یاد آجاتی، اور میں کچھ شرم سی محسوس کرنے لگتا، چند ہفتوں تک تو میں اس سے صرف گریزاں ہی رہا مگر آہستہ آہستہ مجھے اس سے سخت کراہت پیدا ہوگئی، اور میں اسکی مکروہ صورت سے اس طرح بھاگنے لگا جیسے کوئی وبا کے جراثیم سے بھاگتا ہے۔

جس رات کو میں اسے گھر لایا تھا اس کی صبح کو یہ پتہ چلا کہ پلاٹو کی طرح اس کی بھی ایک آنکھ نہ تھی، سب سے پہلے اس چیز نے میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا تھا، مگر میرے برخلاف اسی چیز نے اس کو میری بیوی کا محبوب بنا دیا تھا۔ کیونکہ میں جیسا پہلے بیان کر چکا ہوں کہ میری بیوی میں رحمدلی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

الغرض مجھے اس بلّی سے جتنی نفرت بڑھتی جاتی، اتنا ہی میرے ساتھ اس کی محبّت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جب میں کسی جگہ بیٹھتا تو یہ یا تو میرے پاؤں کے پاس آکر بیٹھ جاتی، یا اچک کر میرے گھٹنوں پر بیٹھ جاتی۔ اگر میں اُٹھ کر چلنے لگتا تو یہ میرے پاؤں کے بیچ میں آجاتی۔ اس کے اس طرح پاؤں سے لگ کر چلنے کی وجہ سے میں کئی مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ اکثر جب میں کھڑا ہوتا تو وُہ اپنے تیز پنجوں سے میرا لباس پکڑ کر میرے سینہ تک چڑھ جاتی۔ ایسے موقعوں پر میرا جی چاہتا کہ میں اس کو فوراً قتل کر دوں، مگر کچھ تو میں اپنے گزشتہ جُرم کو یاد کر کے اس حرکت سے باز رہتا اور کچھ —— مجھے صاف صاف اس کا اقرار کر لینا چاہیے —— اس جانور کے خوف اور دہشت سے۔

مَیں اس جانور سے اس وجہ سے خوفزدہ نہیں تھا، کہ مجھے اس سے کوئی جسمانی صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا، مگر مجھے یہ بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ یہ خوف و دہشت جو مجھے اس جانور سے محسوس ہوتی صرف ایک کمزور واہمہ کی بنا پر تھی۔ میری بیوی نے اکثر مجھے اس کے سینہ کے سفید نشان کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ نشان پہلے صرف ایک بے ڈھنگے دھبے کی طرح تھا مگر یہ دھبّہ آہستہ آہستہ اپنی شکل بدل رہا تھا۔ اس قدر آہستہ آہستہ کہ

اس کی تبدیلی کا احساس ممکن نہ تھا۔ میں بہت عرصہ تک کوشش کرتا رہا کہ میں اس تبدیلی کو صرف اپنے وہم پر محمول کروں مگر اب اس دھبّے نے خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ ایک ایسی چیز کی شکل تھی جس کے نام لینے سے بھی میں دہشت زدہ ہو جاتا ہوں اور یہی وُہ جُز تھی جس کی وجہ سے میں اس بلّی سے متنفّر اور خوفزدہ رہا کرتا تھا، یہ نشان ایک بہت ہی ہولناک چیز — پھانسی کے پھندے کا نشان تھا، موت اور نزع کے کرب و تشنج کا نشان !

اب راحت و اطمینان مجھ سے کوسوں دُور تھا۔ نہ تو مجھے دن کو سکون نصیب ہوتا اور نہ رات کو چین آتا، دن کو تو وُہ خود ایک لمحہ کے لئے میرا پیچھا نہ چھوڑتا، اور رات کو اس کا خیال مجھے ستاتا رہتا۔ بسا اوقات میں نہایت بھیانک خواب دیکھ کر چونک اُٹھتا اور دیکھتا کہ بلّی مجھ سے اس قدر نزدیک ہے کہ اس کی سانس میرے گالوں کو چھُو رہی ہے اور اس کا وزن جو میرے لئے ایک کابوس بن گیا تھا اور جس کو اپنے سینہ سے میں کسی طرح نہ ہٹا سکتا تھا، مستقلاً میرے اُوپر مسلّط رہتا۔

اس رُوحانی اذیّت نے میری رہی سہی اچھائیوں کو بھی تباہ کر دیا۔ بدی اور معصیّت کے خیالات میرے تنہا ساتھی رہ گئے۔ میری طبیعت کی غمگینی اور چڑچڑے

پن میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ میں دُنیا کی ہر چیز اور ہر آدمی سے نفرت کرنے لگا۔ میرے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہ گئی۔ مجھے معمولی سی معمولی بات پر طیش آجاتا۔ مگر میری صابر و شاکر بیوی جو عموماً میرے اس طیش و غضب کا ہدف ہوتی تھی، خاموشی سے اس کو برداشت کرتی رہتی۔

غربت اور افلاس نے ہمیں اُسی پُرانے بوسیدہ اور ٹوٹے ہوئے مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک دن میں اور میری بیوی مکان کے تہ خانے میں اُترنے لگے جہاں گھر کی اکثر چیزیں رکھّی رہتی تھیں۔ جب میں زینہ سے اُتر رہا تھا تو وُہ بلّی حسبِ عادت میرے پاؤں کے بیچ میں آگئی۔ میرا پاؤں اُس سے اٹک گیا اور میں گِرتے گِرتے بچا۔ بلّی کی اس حرکت پر مجھے اس قدر طیش آیا کہ مَیں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اور مجھ پر جنون کا ایک دَورہ سا پڑ گیا۔ بچّوں کا سا وُہ خوف جو مجھے اس کے قتل سے ابھی تک روکے ہوئے تھا بالکل غائب ہو گیا۔ قریب ہی ایک کلہاڑی رکھّی ہوئی تھی وُہ مَیں نے اُٹھالی اور اس کو مارنا چاہتا تھا کہ میری بیوی نے میرا ہاتھ روک لیا۔ اور اگر اُس نے میرا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو اس وقت یقیناً بلّی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ میری بیوی کی اس حرکت نے میرے شیطانی جنون میں اور

بھی اضافہ کر دیا۔ اور بغیر کچھ سمجھے بُوجھے مَیں نے اُس کلہاڑی سے اپنی بیوی پر حملہ کر دیا۔ کلہاڑی سر پر لگی اور اندر دھنستی ہوئی چلی گئی۔ اس غریب نے ایک آہ بھی نہ کی۔ وُہ وہیں مُردہ ہو کر گر پڑی۔

اس ہولناک قتل کے ارتکاب کے بعد مَیں اُس لاش کو چھپانے کی تدابیر سوچنے لگا۔ مَیں یہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ اپنے ہمسایوں کے دلوں میں شبہ پیدا کئے بغیر میں یہ لاش نہ دن کو باہر نکال سکتا ہوں نہ رات کو۔ ذہن میں مختلف تدابیر آئیں۔ پہلے مَیں نے یہ سوچا کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں اور چولھے میں جھونک دوں۔ پھر یہ سوچا کہ اس تہ خانے میں زمین کھود کر دفن کر دوں۔ یا پھر کسی بکس میں بند کر کے کسی قلی کے ذریعہ سے کسی دوسری جگہ پہنچا دوں۔ آخر کار ان تمام تدابیر سے بہت زیادہ بہتر ایک تدبیر میرے ذہن میں آگئی۔ مَیں نے یہ طے کیا کہ جس طرح اگلے زمانے میں خانقاہوں میں رہنے والے پیر و فقیر اپنے شکار کو تہ خانوں کی دیواروں میں زندہ چُن دیا کرتے تھے اسی طرح اس لاش کو بھی تہ خانے کی دیوار میں چُن دیا جائے۔

اس قسم کے کام کے لئے یہ تہ خانہ بہت موزوں تھا۔ اس کی دیوار زیادہ

مضبوط نہیں تھی اور حال ہی میں دیواروں پر بھدّا سا پلاسٹر کرایا گیا تھا۔ چونکہ اس جگہ پر نمی بہت زیادہ تھی اس وجہ سے وُہ پلاسٹر بھی خشک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک نقلی آتش دان تھا جس کی وجہ سے یہاں پر دیوار کی سطح کافی اُونچی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ لاش کو دفن کرنے کی مناسب جگہ یہی ہے۔ اس دیوار کو دیکھ کر کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے گا کہ یہاں پر کوئی لاش پوشیدہ ہے۔

مَیں نے آسانی سے آتشدان کی چمنی کی اینٹیں دیوار سے علیحدہ کر لیں اور لاش کو اس میں کھڑا کر کے اُوپر سے اینٹیں چن کر پلاسٹر کر دیا۔ پلاسٹر سے بالکل یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ اُس حصّہ پر نیا پلاسٹر کیا گیا ہے۔ مَیں اپنی جگہ پر پُوری طرح مطمئن تھا۔

اس کے بعد مَیں نے اس بلّی کو تلاش کرنا شروع کیا جو میری اِن تمام تکالیف کا باعث تھی۔ کیونکہ اب میں نے قطعی طور پر طے کر لیا تھا کہ اس کو ختم ہی کر کے چین لونگا۔ اگر وُہ مجھے اس وقت مل جاتی تو اسی وقت اس کی زندگی کا فیصلہ ہو جاتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ عیّار بلی میرے شدید طیش اور تشدّد سے ڈر کر میرے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس جانور کے

غائب ہو جانے سے مجھے جو بے پایاں اطمینان اور سکون نصیب ہوا ہے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ یہ اُس رات کو بھی نہیں آئی اور اس طرح قتل کے ارتکاب کے باوجود میں نہایت اطمینان سے سویا۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا اور اب میں پھر ایک آزاد انسان کی طرح سانس لینے لگا۔ وُہ عجیب الخلقت مخلوق غالباً دہشت زدہ ہو کر مکان چھوڑ کر بھاگ گئی تھی میں خوش تھا کہ اب میں اُسے پھر کبھی نہ دیکھوں گا۔ یہ خیال میرے لئے انتہائی مسرّت بخش تھا۔ اُس بھیانک اور تاریک فعل کا خیال میرے لئے کچھ زیادہ پریشانی کا باعث نہ تھا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے میری بیوی کے بارے میں دریافت کیا۔ لیکن ان کو فوراً تشفی بخش جواب دے دیا گیا۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میری آئندہ زندگی پُرسکون اور مطمئن گزرے گی۔

قتل کے چوتھے دن خلاف توقع پولیس کی جماعت نے میرے مکان کو گھیر لیا اور پھر نہایت غور سے خانہ تلاشی شروع کی چونکہ مجھے اچھی طرح یقین تھا کہ اُس لاش کا پتہ چلانا آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے مجھے اس تلاشی سے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی میں بالکل مطمئن تھا۔ پولیس افسران کے حکم کے بموجب میں برابر ان کے ساتھ رہا۔ اُنہوں

نے گھر کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ تین چار مرتبہ تہ خانہ کی تلاشی لی۔ مگر مجھ پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دل ایسا ہی مطمئن اور پُرسکون تھا۔ جیسے کوئی معصومانہ اور خوشگوار خواب دیکھنے کے وقت ہوتا ہے۔ مَیں اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پولیس پوری طور پر مطمئن ہوگئی تھی اور جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت میرا جوشِ مسرت اتنا شدید تھا کہ اس کو روکنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میرا دل اس فتح اور کامیابی پر کچھ کہنے کے لئے بیتاب تھا۔ خواہ وُہ ایک ہی حرف کیوں نہ ہو۔ چنانچہ جب پولیس والے تہ خانے کے زینہ پر چڑھنے لگے تو مَیں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "حضرات! مجھے مسرت ہے کہ مَیں آپ کے شکوک رفع کرنے میں آپ حضرات کی مدد کر سکا۔ خُدا آپ کو تندرست اور مطمئن رکھے۔ لیکن جملہ معترضہ کے طور پر مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ یہ مکان نہایت عمدہ طریقہ سے بنایا گیا ہے (میرا دل کچھ کہنے کے لئے اس طرح بیتاب ہو رہا تھا کہ مجھے خود یہ نہیں معلوم تھا کہ مَیں کیا کہہ رہا ہوں) بلکہ مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ غیر معمولی طور پر عمدہ بنایا گیا ہے! یہ دیواریں ——— کیا آپ حضرات تشریف لئے جا رہے ہیں ———؟ یہ دیواریں نہایت مضبوطی سے بنائی گئی ہیں۔ یہاں پہنچکر محض اپنی

بہادری جتانے کی خاطر مَیں نے دیوار کے عین اُس مقام پر جہاں میری مظلوم بیوی کی لاش تھی ایک لکڑی سے جو میرے ہاتھ میں تھی زور سے کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کھٹکھٹانے کی آواز ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ دیوار کے اندر سے ایک آواز آئی جو پہلے بہت دھیمی تھی جیسے کوئی بچہ ہچکیاں لیتا ہے۔ مگر فوراً ہی وہ ایک لمبی پُرشور چیخ میں بدل گئی۔ ایک دلگداز چیخ کی صدا جس میں دہشت اور فتح مندی کا ایک عجیب امتزاج تھا۔ ایسی صدا جو صرف جہنّم کی گہرائیوں ہی سے بلند ہو سکتی ہے۔ جہاں گناہگار اور فرشتہ ہائے عذاب دہشت اور کامرانی میں ایک ساتھ چیختے ہیں۔

میرا خود اپنے بارے میں کچھ کہنا بیکار ہوگا۔ مَیں فوراً بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پولیس کی جماعت خوف و دہشت سے چند لمحے تو زینہ پر بالکل ساکت کھڑی رہی اور پھر اُنہوں نے دیوار کو کھودنا شروع کیا۔ دو ہی چار ضربوں میں دیوار کے اُوپر نئی چُنی ہوئی اینٹیں ایک ساتھ گر پڑیں۔ خون سے نہاتی ہوئی لاش جو سڑنا شروع ہو گئی تھی سامنے دیوار میں کھڑی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر انگارے کی طرح دہکتی ہوئی لال لال آنکھ کھولے ہوئے بلّی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کی شرارت نے مجھے پہلے ہولناک قتل پر اُکسایا اور پھر اپنی آواز سے مجھے

تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے میں نے اس لاش کے ساتھ بلّی کو بھی دیوار میں چن دیا تھا۔

(ایڈگر ایلن پو) (نگار اکتوبر ۱۹۴۵ء)

# شرط

رُوسی ادیب چیکوف جس مرتبہ کا فسانہ نگار تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اُردو میں بھی متعدد افسانے آ چکے ہیں لیکن انگریزی سے میں نے یہ افسانہ عربی سے لیا ہے۔ چیکوف کے اندازِ تحریر کا تتبع آسان نہیں۔ علی الخصوص اُس وقت جب کہ ترجمہ بھی اصل زبان سے نہ لیا گیا ہو۔ تاہم اس سے تھوڑا بہت یہ اندازہ ضرور ہو جائیگا کہ چیکوف کے افسانوں میں وُہ کیا بات ہے جو یورپ کے دوسرے افسانہ نگاروں میں نہیں پائی جاتی

نیازؔ

موسمِ خریف کی ایک تاریک رات میں، ایک صرّاف اپنے کمرے میں بیتابانہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور پندرہ سال قبل کی ایک رات کے واقعات اس کے سامنے ہیں۔ جب اُس نے بعض اپنے معزّز دوستوں کی دعوت کی تھی اور دورانِ گفتگو میں بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ قتل کی سزا قصاص مناسب ہے یا نہیں۔

بعض نے اس طریقِ سزا کو مذہب و اخلاق کے منافی ظاہر کیا اور یہ رائے دی کہ قصاص سے بہتر حبسِ دوام ہے۔ یہ سُن کر اُس صراف نے کہا کہ میں اس رائے کے موافق نہیں۔ ہر چند نہ مجھے حکمِ موت کے اثرات کا تجربہ ہے نہ حبسِ دوام کی تلخی کا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قصاص مذہب و اخلاق کی مراعات سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت حبسِ دوام کے۔ کیونکہ قصاص سے مُراد ہے رشتۂ حیات کو دفعتہً قطع کر دینا اور حبسِ دوام قتل تدریجی ہے۔ پھر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ چند سیکنڈ کے اندر موت کا آجانا بہتر ہے یا برسوں میں تھوڑا تھوڑا کرکے اس کو دعوت دینا۔"

ایک نے کہا "میرے نزدیک دونوں نامناسب ہیں۔ کیونکہ دونوں کی غرض ایک ہے یعنی وہی شعلۂ حیات کا بجھا دینا اور حکومت کوئی بھی ہو بہرحال خُدا تو

ہے نہیں۔ اس لئے اس کو کسی ایسی چیز کے لینے کا کیا حق حاصل ہے جسے پھر وُہ واپس نہیں کر سکتی۔"

انہیں مہمانوں میں سے ایک وکیل بھی تھا جس کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ یقیناً دونوں سزائیں تہذیب شائستگی کے منافی ہیں۔ لیکن اگر میرے سامنے یہ دونوں صُورتیں پیش کی جائیں تو میں دوسری صُورت کو اختیار کروں۔ کیونکہ زندگی بہر حال زندگی ہے۔ خواہ وُہ کسی حال میں بسر ہو اور انقطاعِ حیات سے بدرجہا بہتر۔"

چونکہ صرّاف ابھی نوجوان تھا اور فطرۃً اس کو جلد غصّہ آجاتا تھا اس لئے جب گفتگو بڑھی تو اس نے میز پر زور سے ہاتھ مار کر وکیل سے کہا کہ "یہ بالکل لغو ہے اور کبھی نہیں مان سکتا۔ میں تم کو ۲ لاکھ روپیہ دینے کی شرط کرتا ہوں اگر تم صرف پانچ ہی سال تک قید کی حالت پر صبر کر سکو۔"

وکیل نے جواب دیا۔ "اگر تم واقعی سنجیدگی سے کہتے ہو اور اس میں مذاق شامل نہیں ہے تو میں پانچ کیا پندرہ سال تک قید میں رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

صرّاف نے حیرت سے کہا۔ "پندرہ سال! اچھا تو اس پر میرا تمہارا

اتفاق ہے اور آپ سب لوگ اس عہد و پیمان کے گواہ رہیں"۔

وکیل نے کہا "میں پھر اس عہد کی توثیق کرتا ہوں، تم ۲۲ لاکھ روپیہ کو خطرہ میں ڈالو اور میں اپنی جان کو"

ہنسی مذاق میں یہ معاہدہ ہونے کو تو ہو گیا۔ لیکن لوگوں نے وکیل کو سمجھا کر ۲۲ لاکھ روپیہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اختیاری قید اضطراری قید سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور تم پندرہ کیا پانچ سال بھی اس مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتے"۔

---

یہ مخاصمہ واقعہ جو پندرہ سال قبل صرّاف کی دکان میں ہو چکا تھا اور اب اس کو یاد کر کے وہ بے تابانہ اپنے کمرہ میں ٹہل رہا تھا اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا:-

"میں نے کیوں یہ شرط کی۔ اس سے کیا فائدہ تھا۔ غریب وکیل نے اپنی عمر کے ۱۵ سال برباد کئے اور مجھے ۲۲ لاکھ روپیہ ضائع کرنے پڑیں گے۔ کیا اس سے واقعی یہ فیصلہ ہو جائیگا کہ قصاص اور قید میں کون سی عقوبت مناسب ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں نے اس وقت صرف عارضی جوش میں آکر یہ شرط کر لی اور

اُس نے روپیہ کے لالچ سے۔"

اس کے بعد صرّاف کو وُہ تمام باتیں یاد آئیں جو اس رات کے بعد ہوئی تھیں۔ اس شرط کے بعد یہ انتظام کیا کہ وکیل صرّاف ہی کے مکان کے ایک حجرہ میں مقید کیا جائے اور وُہ پندرہ سال کے دوران میں نہ کسی سے بات کر سکے نہ کسی کی آواز سُن سکے اور نہ کسی انسان کو دیکھ سکے۔ خط و کتابت کی بھی ممانعت تھی۔ البتہ اس کو یہ اجازت ضرور دی گئی تھی کہ کوئی ساز موسیقی کا اپنے ساتھ رکھ سکے اور کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ اس کو شراب پینے اور تمباکو استعمال کرنے کی بھی اجازت تھی۔ اور وُہ ضروری اشیاء کے متعلق پُرزہ لکھ کر ایک چھوٹی کھڑکی کی راہ سے باہر پھینک سکتا تھا۔ ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کی آدھی رات سے میعاد قید شروع ہوئی اور ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کی آدھی رات کو ختم ہوگی۔ اگر اس درمیان میں اس نے کسی شرط کی خلاف ورزی کی یا ایک منٹ قبل اپنے حجرہ سے نکلا تو وُہ روپیہ پانے کا مستحق نہ ہوگا۔

---

اُن تحریروں سے جنہیں وکیل حجرہ کی کھڑکی سے وقتاً فوقتاً باہر پھینکا کرتا تھا یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ اُس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔

چنانچہ پہلا سال اس نے بغیر کسی اضطرار و پریشانی کے بسر کر دیا۔ رات دن پیانو کی آواز اس کے حجرہ سے آتی رہتی تھی۔ اس نے شراب اور تمباکو بھی طلب نہیں کی۔ اس نے اپنی ڈائری میں اس سال کے متعلق یہ یادداشت لکھی تھی "مسکر چیزوں کا استعمال خواہشات میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔ جو تبدیل کا سخت دشمن ہے۔ تمباکو کا دھواں چونکہ کمرہ کی ہوا کو مضر کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کا استعمال بھی مناسب نہیں"۔ پہلے سال جو کتابیں وقت کاٹنے کے لئے اس نے طلب کیں وہ صرف قصص و حکایات کی تھیں۔

دوسرے سال پیانو کی آواز موقوف ہو گئی اور اخلاق کی کتابیں اس نے طلب کیں۔ پانچویں سال پھر پیانو بجانا شروع کیا اور شراب بھی طلب کی۔ جن لوگوں نے اس سال اُسے دیکھا ان کا بیان ہے کہ کھانے پینے میں وُہ اپنا وقت بہت کم صرف کرتا تھا اور سونا بھی کم تھا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیا کرتا اور ہر وقت غیظ و غضب کی سی کیفیت اس پر طاری رہتی۔ کتابوں کا مطالعہ بھی ترک کر دیا۔ رات رات بھر میز پر بیٹھا لکھا کرتا اور صبح کو چاک کر کے پھینک دیتا۔

چھٹے سال کا نصف حصّہ گزرنے کے بعد پھر اس کی حالت میں تغیّر

پیدا ہوا اور اس نے فلسفہ تاریخ، اور مختلف زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ کی اور اس قدر انہماک کے ساتھ کہ چار سال کے اندر اُس نے ۶۰۰ کتابوں کا مطالعہ کیا۔

چنانچہ ایک دن اُس نے کھڑکی سے ایک خط لکھ کر باہر پھینکا جس میں صرّاف سے اس طرح خطاب کیا گیا تھا:۔

"میں یہ تحریر سات زبانوں میں لکھتا ہوں۔ مہربانی فرما کر ان زبانوں کے جاننے والوں کو دکھا کر معلوم کیجیے کہ میں نے صحیح لکھا ہے یا نہیں اگر صحیح ہو تو ایک بندوق کا فیر کر دیجیے تا کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میری محنت بیکار نہیں گئی۔ ہر زمانہ و ملک کے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے فضلا نے مختلف زبانوں میں اپنے خیالات کو ظاہر کیا۔ لیکن اُن سب کے سینوں میں عبقریت کی وہی ایک آگ مشتعل تھی۔ کاش آپ کو معلوم ہو سکتا کہ ان زبانوں کے سیکھنے اور مختلف زبانوں کے علماء کے خیالات معلوم کرنے کے بعد میں کس قدر حریصِ علم ہو گیا ہوں"۔

دس سال کے بعد یہ اپنی میز کے سامنے ایک بُت کی طرح بیٹھا رہتا تھا اور

صرف عہدِ جدید (انجیل) کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ صرّاف کو تعجب تھا کہ وہ شخص جس نے چار سال میں ۶۰۰ کتابوں کا مطالعہ کرکے اتنا بڑا ذخیرہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا اپنے دماغ میں فراہم کر لیا ہے۔ وُہ اب انجیل ایسی مختصر اور آسان کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہے۔

قید کے آخری دو سالوں میں اس کی یہ حالت تھی کہ بغیر تفریق و امتیاز کے جو کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی تھی اس کو دیکھنے لگتا تھا۔ جب قید کی میعاد ختم ہونے کے قریب آئی تو صرّاف نے اپنے جی میں کہا کہ کل بارہ بجے میعاد ختم ہو جائیگی اور مجھ کو حسب وعدہ ۲ لاکھ روپیہ دینے پڑیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مَیں بالکل مفلس ہو جاؤنگا اور میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ رہیگا۔"

پندرہ سال قبل صراف بہت دولتمند تھا لیکن اس زمانہ میں اس کو تجارت وغیرہ میں کافی نقصان اُٹھانا پڑا تھا اور اس کی مالی حالت بہت مستقیم ہو گئی تھی۔

وُہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھّے ہُوئے سوچ رہا تھا۔ شرط بھی کیسی ملعون چیز ہے اور دیکھو تو یہ مردود دکیل مرا بھی تو نہیں کہ مَیں اس عذاب سے چھوٹ جاتا لیکن وُہ کیوں مرنے لگا وُہ تو ۲ لاکھ روپیہ مجھ سے لے گا۔ شادی

کریگا۔عیش و نشاط کی زندگی بسر کریگا اور مَیں؟ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر بھیک مانگونگا۔ اور در در کی ٹھوکریں کھاؤں گا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے اور رہائی کی تدبیر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس کو مر جانا چاہیئے بلبشیک اس کی موت ضروری ہے۔"

رات کے تین بج چکے تھے اور حرّاف نے اسی کرب و اضطرار کے عالم میں اتنی رات جاگ کر کاٹ دی تھی۔ گھر میں ہر طرف سنّاٹا تھا اور ہر شخص گہری نیند میں مصروف تھا۔ اُس نے دروازہ کی کنجی لی جو پندرہ سال قبل بن گیا گیا تھا۔ عبا پہنی اور کمرہ سے باہر آیا۔ سردی شدید تھی اور تاریکی نہایت گہری۔ وُہ دیوار کو اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہُوا باغ میں پہنچا اور وہاں سے اس حجرہ تک گیا جہاں وکیل مقیّد تھا۔ اس نے پہرہ دار کو آواز دی لیکن وُہ غافل سو رہا تھا۔ دروازہ پر پہنچکر اس نے دیاسلائی روشن کی اور دیکھا کہ قفل اسی طرح بند ہے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ وکیل میز کے پاس کُرسی پر بیٹھا ہُوا ہے۔ پشت دریچہ کی جانب ہے۔ سر کے بال شانوں پر بکھرے ہُوئے ہیں اور کتابیں چاروں طرف منتشر پڑی ہیں۔

اُس نے پانچ منٹ تک انتظار کیا لیکن اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اتنی طویل مدت تک قید میں رہنے سے اس کو ایک بُت کی طرح ساکت بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ صراف نے دریچہ کے شیشہ کو انگلی سے کھٹ کھٹایا۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا اور نہ وکیل کے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ صراف دروازہ پر گیا اور قفل میں کنجی ڈال کر اس کو گھمایا اور اس کھٹکے سے بھی وُہ نہ چونکا۔ یہ اندر داخل ہُوا اور اُس نے دیکھا کہ وکیل بہت دُبلا ہو گیا ہے اور سوائے استخوان و پوست کے کچھ اس کے جسم میں نہیں رہ گیا ہے۔ چہرہ زرد ہے۔ گال بیٹھے ہوُئے ہیں۔ ہات سوکھ گئے ہیں پیٹھ میں خم آگیا ہے۔ سر کے بال سپید ہیں، ڈاڑھی کے بال بڑھ کر اُلجھ گئے ہیں، سامنے ایک تحریر نہایت باریک خط میں لکھی ہوئی رکھی ہے۔ صراف نے اپنے جی میں کہا کہ یہ نہایت گہری نیند سو رہا ہے اور شاید وُہ اس وقت انہیں ۲ لاکھ روپیوں کا خواب دیکھ کر خوش ہو رہا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ہلاک کرنا میرے لئے بہت آسان ہے۔ لیکن پہلے مجھے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس نے اس تحریر میں کیا لکھا ہے۔

اُس نے کاغذ اُٹھایا اور دیکھا تو اس میں لکھا تھا:۔

"کل بارہ بجے میری نیند کی میعاد ختم ہو جائیگی اور میں پھر آزاد ہو کر اپنے ابنائے جنس سے مل سکونگا۔ لیکن قبل اس کے کہ حجرہ کو چھوڑوں اور آفتاب کی روشنی کو دیکھوں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اے اہلِ دنیا چند کلمات تم سے کہہ دوں۔ اس لئے میں اپنے صاف و پاک ضمیر کے ساتھ اس خدا کے سامنے جو میری صداقت کا شاہد ہے ظاہر کرتا ہوں کہ میں زندگی، آزادی، صحت اور ہر اس چیز کو جسکو اس دنیا کی برکات میں شمار کیا جاتا ہے ایک سرے سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں نے کامل پندرہ سال تک حیات دنیاوی کا مطالعہ کیا اس حال میں کہ اس عرصہ تک نہ میں نے زمین کو دیکھا اور نہ اس پر کسی چلنے پھرنے والے انسان کو۔ لیکن تمہاری کتابوں سے میں نے ہر وہ علم حاصل کر لیا جو آنکھ کان اور دیگر حواس کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسرارِ طبیعت مجھ پر منکشف ہو گئے۔ علوم و فنون کے پوشیدہ نکات مجھ پر روشن ہو گئے اور تمام وہ راز بے نقاب ہو گئے جو کسی بڑے سے بڑے فیلسوف و حکیم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ کتابوں کے ذریعہ

سے کائنات کی بلندیوں اور گہرائیوں تک پہنچا۔ یہاں تک کہ اس وقت میں اس آسمان کے نیچے سب سے بڑا دانا انسان کہلایا جا سکتا ہوں۔ اس لیئے میں تم کو بتاتا ہوں کہ جن چیزوں کو تم زندگی کے برکات کہتے ہو وُہ میرے نزدیک ہیچ ہیں۔ ان کا وجود صرف ایک سایہ ہے ہٹ جانے والا، ایک رنگ ہے اُڑ جانے والا۔ وہ مکھی سے زیادہ حقیر اور سراب سے زیادہ پُرفریب ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم جاہ و مال، دولت و ثروت، حسن و جمال پر فخر کرتے ہو۔ حالانکہ یہ سب وہم باطل سے زیادہ نہیں۔ تم گمراہی میں مبتلا ہو۔ تم ایسے جنون میں مبتلا ہو جس سے زیادہ کوئی جنون نہیں ہو سکتا۔ تم گمراہی کو ہدایت پر، کذب کو صداقت پر، حرام کو حلال پر ترجیح دیتے ہو اور کھرا چھوڑ کر کھوٹا لینا چاہتے ہو چنانچہ میں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وُہ صحیح ہے۔ اُن ۲ لاکھ روپیہ کے لینے سے انکار کرتا ہوں اور اس لیے کہ میں ان کا حسبِ معاہدہ مستحق بھی نہ رہوں وقت مقررہ سے پانچ منٹ قبل اپنی قید سے نکل جاؤں گا۔"

صرّاف نے اس تحریر کو پڑھ کر میز پر رکھ دیا اور ایک خاص کیفیت لئے ہوتے واپس آیا۔ وہ اپنی دناءت اور ذلّت کا احساس کر کے اپنے اوپر نفرین کر رہا تھا اور بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن نیند کسی طرح نہ آتی تھی۔

دوسرے دن دوپہر کو پہرہ دار آیا اور کہا کہ جو شخص حجرہ میں قید تھا۔ دریچہ سے کود کر باغ میں آیا اور وہاں سے باہر چلا گیا۔ صرّاف اپنے خادموں کو لے کر وہاں پہنچا اور سب کو اس امر کا شاہد کر کے کہ وکیل وقت مقررّہ سے قبل بھاگ گیا ہے۔ اس تحریر کو جواب بھی رکھی ہوئی تھی چپکے سے لے کر اس نے بکس میں محفوظ کر دیا۔

(نگار دسمبر ۱۹۲۸ء)

# شرلاک ہومز کا مرضِ موت

مسز ہڈسن (اس مکان کی مالکہ جس کی بالائی منزل میں شرلاک ہومز سکونت رکھتا تھا) اس میں شک نہیں کہ اپنی غیر مطمئن زندگی کے لحاظ سے سخت بدقسمت عورت تھی کیونکہ ہومز کی بے اصول معاشرت۔ اُس کے پاس ہر وقت بُرے بھلے لوگوں کی آمد و رفت۔ اور سب سے زیادہ خود ہومز کی مجنونانہ حرکتوں نے اس کو پریشان کر رکھا تھا۔

ہومز آدھی رات کو اُٹھتا اور گانا شروع کر دیتا۔ رات کے دو بجے بیدار ہوتا اور پستول کی مشق کرنے لگتا۔ کبھی ساری ساری رات چھت پر زور زور سے ٹہلنے میں بسر کر دیتا۔ اور کبھی ساری شب وُہ علمی تجربوں اور دوسرے ہنگامہ خیز

مشاغل میں گزار دیتا۔ ظاہر ہے کہ مسز ہڈسن ان صورتوں میں نہ اطمینان سے سو سکتی تھی نہ سکون کے ساتھ کوئی اور کام کر سکتی تھی۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ ہومز سے اس کو مالی فائدہ بہت تھا اور کچھ اُس تعلقِ دیرینہ کی وجہ سے جو اتنے عرصہ کے قیام میں اس کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ وُہ نہ صرف ان تمام تکلیفوں کو برداشت کرتی تھی بلکہ ہومز کی وُہ بہت عزّت کرتی تھی اور اس سے متنفر ہونے کی بجائے اس کی زندگی پر اپنا دل دکھاتی تھی۔

میری شادی کو دوسرا سال تھا اور مَیں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہُوا کچھ سوچ رہا تھا کہ مسز ہڈسن دفعتاً گھبرائی ہوئی آئی اور بولی کہ "ڈاکٹر واٹسن! تمہارا دوست ہومز قریب المرگ ہے۔ تین دن سے اس کی حالت بدتر ہوتی جاتی ہے اور شاید ہی آج کا دن خیریت سے گزرے۔ مَیں نے بہت کہا۔ لیکن وُہ کسی طرح ڈاکٹر بلانے پر راضی نہیں ہوا۔ آج جب مَیں نے اس کی حالت زیادہ خراب دیکھی تو بولی کہ "تم اجازت دو یا نہ دو مَیں تو جاتی ہوں اور کسی کو بلا کے لاتی ہوں"۔ یہ سُن کر وُہ بولا کہ اچھّا واٹسن کو بلا لاؤ۔" اس لئے میں تمہارے پاس آئی ہوں اگر تم نے ایک گھنٹہ کی بھی دیر کی تو مَیں نہیں کہہ سکتی وُہ تمہیں زندہ بھی ملے گا یا نہیں"۔

یہ سُن کر میں گھبرا گیا کیونکہ اس سے قبل ہومز کی علالت کا کوئی حال معلوم نہ ہوا تھا۔ مَیں نے فوراً کپڑے پہنے اور مسز ہڈسن کے ساتھ ہولیا۔ راستہ میں مَیں نے اس سے زیادہ تفصیلی حالات معلوم کئے تو پتہ چلا کہ وُہ دریا کے قریب کسی گندی گلی میں چند دن سے ایک معاملہ کا سراغ لگا رہا تھا اور وہیں سے یہ بیماری لایا گذشتہ بدھ کی سہ پہر سے صاحب فراش ہے اور اس دوران میں اُس نے نہ غذا کی نہ پانی پیا اور حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے"

جس وقت مَیں ہومز کے کمرے میں پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ ہونٹ خشک تھے اور آنکھ اور رخسار سے بخار کی سرخی اور چمک نمایاں تھی۔ وُہ مجھ کو دیکھ کر نہایت ضعیف آواز سے بولا کہ :۔

"کیوں واٹسن آخر کار وقت آ ہی گیا"

"میں اس کے قریب پہنچکر اس کی نبض دیکھنا چاہتا تھا کہ ہومز نے حد درجہ اضطراب کے ساتھ کہا کہ "خبردار میرے پاس نہ آنا"۔ مَیں نے پوچھا "کیوں"؟ اس نے جواب دیا کہ "میری خواہش یہی ہے کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے" مَیں کچھ دیر تک اس کی حالت کو دیکھ کر افسوس کرتا رہا اور پھر بولا کہ "ہومز میں

تمہارے علاج کے لئے آیا ہوں اور بیمار کی خواہش کوئی چیز نہیں ہوا کرتی"۔

ہومز:۔"لیکن میں تم کو تمہارے ہی فائدہ کی وجہ سے اپنے پاس نہیں آنے دیتا۔ کیونکہ جس مرض میں مبتلا ہوں وہ ان قُلیوں کی بیماری ہے جو جزیرہ سماترا سے پھیلی ہے اور یہ اس قدر سخت متعدّی ہے کہ صرف چھُونے سے دوسروں کو لگ جاتی ہے"

یہ سُن کر میں نے کہا "اگر یہ صحیح بھی ہو کہ چھُونے سے بیماری لگ جاتی ہے تو بھی ہومز تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے لئے میں اس کی کیا پرواہ کر سکتا ہوں"

یہ کہہ کر میں پھر آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ ہومز نے بہت زیادہ برہمی کے ساتھ کہا کہ "اگر تم رہ سکتے ہو تو رہو۔ ورنہ چلے جاؤ"

میں ہومز کی اس قدر عزّت کرتا تھا کہ کبھی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کی لیکن اب جب کہ وہ بیمار تھا اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا تھا میں اپنے پیشہ کے فرائض کو شدّت سے محسوس کرنے لگا۔ اور ہومز کی اس برہمی کی پرواہ نہ کر کے بولا کہ "ہومز تم اس وقت حواس میں نہیں ہو۔ بیمار ہو کر آدمی بچّہ ہو جاتا ہے۔ تم کچھ بھی کہو میں ضرور معائنہ کر کے تمہارا علاج کرونگا"

یہ سُن کر اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا "اگر کسی ڈاکٹر

کا علاج کرنا ضروری ہے تو پھر کوئی شخص ایسا ہونا چاہیئے جس پر مجھے اعتماد ہو"۔ میں نے جواب دیا" کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے"؟

ہومز"۔ تمہاری دوستی پر ضرور اعتماد ہے۔ لیکن واٹس معاف کرنا ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا"۔ یہ سُن کر مجھے سخت تکلیف پہنچی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو زیادہ متاثر نہیں ہونے دیا اور بولا کر"۔ اگر مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو میں کوئی دخل نہ دونگا۔ لیکن یہ تو اجازت دو کہ میں کسی اور ڈاکٹر کو لے آؤں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں مرتا ہوا دیکھوں اور خاموش بیٹھا رہوں"۔

ہومز"۔ تم کو میری گفتگو سے تکلیف پہنچی ہو گی لیکن میں تم پر تمہاری عدم واقفیت ظاہر کرنے کے لئے یہ سوال کرونگا کہ تم تپانلی بخار اور فارموسا کے امراضِ سیاہ کی بابت کیا علم رکھتے ہو"؟

"میں نے تو کبھی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں سُنا"۔

"واٹس! مشرق میں بہت سی عجیب و غریب بیماریاں ہیں جن کا علم مغرب کے ڈاکٹروں کو نہیں ہے۔ حال ہی میں ایک معاملہ کی تفتیش کے سلسلہ میں مجھے بہت سی ایسی بیماریوں کا نہ صرف علم ہوا ہے بلکہ انہیں میں سے ایک

میں مُبتلا بھی ہو گیا ہوں جس کا علاج تم نہیں کر سکتے۔"

اچھا تو مَیں ڈاکٹر انسٹری کو بلانے جاتا ہوں جو گرم ممالک کی بیماریوں کا اس وقت بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر میں جانا ہی چاہتا تھا کہ ہومز نے شیر کی طرح جست کی اور فوراً دروازہ کے قفل میں کُنجی لگا کر پھر بستر پر گر پڑا جیسے کوئی گولی کھا کر پڑ جائے اور بولا "میں جانتا ہوں تم میری بھلائی چاہتے ہو لیکن جب تک میں اجازت نہ دوں تم نہ جاؤ جس کو میں کہوں اُسے بُلا کے لاؤ۔ اب چار بجے ہیں تم چھ بجے جاؤ اور اس وقت تک تم مجھے خاموش پڑا رہنے دو کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مَیں نے بھی ارادہ کر لیا کہ چھ بجے تک خاموشی کے ساتھ انتظار کرونگا۔ چند منٹ تک مَیں اسکے مضمحل و افسردہ چہرہ کو دیکھتا رہا اور یہ محسوس کر کے شاید وُہ سو گیا ہے۔ آہستہ آہستہ اُٹھا تاکہ کمرے کے دیواروں پر لٹکی ہوئی مجرموں کی تصاویر کو دیکھوں۔ اتفاقاً میری نگاہ اُس میز پر پڑی جہاں مختلف چیزیں منتشر حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔ اُنہیں میں ایک چھوٹا سا صندوقچہ ہاتھی دانت کا نظر آیا اور مَیں نے چاہا کہ اُسے اُٹھا کر دیکھوں لیکن میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ہومز دفعتہً چیخ اُٹھا

اور ایسی بھیانک آواز سے چیخا کہ میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے اور حسنِ فن میں نے اس کو پلٹ کر دیکھا تو سخت خوف مجھ پر طاری ہُوا کیونکہ اس کے جسم کی رگیں کھنچی ہوئی تھیں، چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں صندوقچہ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہی بولا کہ "فوراً" رکھ دو۔ اسی لمحہ میں میز پر رکھ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میری چیزوں کو چھُوئے کیا تم مجھے پریشان کرنے آتے ہو"۔ یہ کہہ کر وُہ پھر بستر پر پڑ گیا۔ اور مجھے اس کے اِس انداز سے سخت تکلیف پہنچی لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ یقیناً" اس کا دماغ متاثر ہے اور بحرانی کیفیت اس پر طاری ہے خاموش ہو گیا۔

اب چھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پھر اُس نے سلسلہ گفتگو شروع کیا اور بولا کہ مسٹر واٹسن تمہاری جیب میں کچھ ہے یا نہیں"؟

میں نے جواب دیا کہ "ہاں ہے"۔

"کوئی چاندی کا سکہ ہے"؟

"بہت ہیں"۔

"کتنے"؟

"پانچ"۔

"بہت کم ہیں بہرحال تم چاندی کے سکّے تو جیب گھڑی میں رکھ لو اور باقی خردہ پتلون کی جیب میں تاکہ توازن درست ہو جائے۔" میں سمجھ گیا کہ وہ ہذیانی کیفیّت میں مبتلا ہے اور اسی طرح بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا کہ گیس روشن کردو لیکن نصف۔ میرے پاس میز پر کاغذ اور خطوط رکھ دو۔ اور اسی صندوقچہ کو چمٹے سے پکڑ کر میرے قریب لے آؤ۔" جب میں یہ کر چکا تو اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا "اب تم جاؤ اور مسٹر کلورٹن اسمتھ کو جو نمبر ۱۳ لوربرک اسٹریٹ میں رہتا ہے۔ بلا لاؤ۔"

میں اس کی ہذیانی حالت سے مایوس ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب کسی ڈاکٹر کا آنا بیکار ہوگا۔ لیکن یہ خیال کرکے کہ کیوں اس کی اس خواہش کو مسترد کیا جائے۔ میں تیار ہو گیا۔ لیکن چونکہ میں اس شخص سے واقف نہ تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ میں نے تو یہ نام کسی ڈاکٹر کا نہیں سنا ہے۔"

ہومز۔ "تمہارا نہ سننا ممکن ہے۔ کیونکہ وہ شخص جو اس مرض کا ماہر ہے کوئی ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک زراعت پیشہ شخص ہے مسٹر کلورٹن اسمتھ سماترا کے مشہور باشندوں میں سے ہے اور آج کل لندن میں مقیم ہے۔ اس کی زرعیہ کاشت میں یہ مرض پھیلا اور اس کو کافی مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ بڑا

بااُصول انسان ہے اور چونکہ چھ بجے سے قبل وُہ نہیں مل سکتا تھا اس لئے مَیں نے تمہیں اُس وقت تک روکا۔ اگر تم اُسے کسی طرح یہاں تک لاسکو تو مجھے اُمیّد ہے کہ وُہ میری مدد کر سکیگا۔

ہومز کی ساری گفتگو کا خلاصہ یہ تھا ورنہ اس نے اس مُدعا کو خدا جانے کس قدر ٹوٹے الفاظ میں سانس توڑ توڑ کر بیان کیا۔ گزشتہ چند گھنٹوں کے اندر ہی اس کی صُورت بہت بدل گئی تھی۔ اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہُوئے کہا کہ "تم اُس سے صرف میری موجودہ کیفیّت بیان کر دو اور حسبِ حال میں تم مجھے دیکھ رہے ہو وُہ اس سے جا کر کہہ دو۔ ایک مرنے والے ہذیانی انسان کی جو حالت ہو سکتی ہے اس کا ذکر اس سے کر دو۔ میری زندگی اس کے آنے پر منحصر ہے اس کو کسی نہ کسی طرح مجبور کر دو کہ یہاں آجائے۔ وُہ مجھ سے برہم ہے۔ اُس کے بھتیجے کے معاملہ میں میری اُس کی مخالفت ہو گئی ہے۔ اس لئے وُہ مجھ سے ضرور عداوت رکھتا ہو گا تاہم اگر تم اُسے یہاں کسی طرح لا سکتے ہو تو میری جان بچ سکتی ہے ورنہ نہیں۔"

"میں ابھی جاتا ہُوں اور گاڑی میں بٹھا کر لاتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں اگر وُہ یہاں آنے کا اقرار کرے گا تو ضرور

آئیگا۔ اور پھر تم کوئی بہانہ کرکے وہاں سے چلے آنا۔ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ تم اس کے ساتھ آؤ گے۔"

مَیں اُس کی ہدایات سُن کر نیچے اُترا اور یہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر مسٹر مارٹن سادہ لباس میں مجھے ملا۔ اُس نے ہومز کا حال مجھ سے دریافت کیا اور مَیں نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ "حالت بہت نازک ہے"۔ اُس نے یہ سُن کر خاص انداز سے مجھے دیکھا اور بولا کہ "ہاں میں نے بھی ایسا ہی سُنا ہے"۔ مَیں اس گفتگو کے بعد گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔

مسٹر کلورٹن مکان پر موجود تھا۔ لیکن جس وقت اس کا ملازم میرا کارڈ لے کر گیا تو اس نے اس قدر زور سے کہ مَیں باہر بھی سُن سکتا تھا دریافت کیا کہ یہ شخص کون ہے۔ وُہ کیا چاہتا ہے۔ مَیں نے تم کو بارہا سمجھایا کہ مطالعہ کے اوقات میں حرج نہ کیا کرو۔ جاؤ کہہ دو کہ مَیں اس وقت نہیں مل سکتا۔ اگر واقعی اس کو کوئی ضرورت ہے تو صبح آئے۔"

مَیں یہ سُنکر سخت فکرمند ہوا اور ہومز کا بسترِ مرگ پر تڑپنا میرے سامنے آگیا۔ خادم یہ پیغام لے کر باہر آیا تھا کہ مَیں بغیر حصولِ اجازت اُس کو ایک طرف کرکے کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔

مجھ کو دیکھتے ہی وُہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا ” اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا مَیں نے تم سے ابھی نہیں کہلا بھیجا کہ کل ملنا “

مَیں نے جواب دیا کہ ” اس مداخلت کی معافی چاہتا ہوں لیکن چونکہ معاملہ بہت اہم تھا اور مسٹر ہومز “

ہومز کا نام سنتے ہی اس کا غصّہ فرو ہو گیا اور گھبرا کر کہا ” کہ مسٹر ہومز کو کیا ہو گیا ہے “ ؟ مَیں نے کہا کہ ” وہ سخت بیمار ہے اور اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں “۔

اس نے ایک کرُسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا کہ ” مجھے یہ سُن کر بیحد صدمہ ہوا ہر چند میں ہومز کو کم جانتا ہوں صرف ایک معاملہ کے سلسلہ میں سرسری ملاقات ہو گئی تھی لیکن مَیں اس کی بہت عزّت کرتا ہُوں وُہ تفتیشِ جرائم کا دلدادہ ہے اور مَیں تحقیقِ امراض کا۔“

” اِسی لئے ہومز نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور اُس کا خیال ہے کہ لندن میں صرف آپ ہی اُس کی جان بچا سکتے ہیں “۔

یہ سُن کر وہ چونکا اور بولا کہ ” مسٹر ہومز نے یہ خیال کیوں پیدا کیا کہ صرف مَیں ہی اس کی مدد کر سکتا ہوں “۔

"کیونکہ آپ مشرقی امراض کے ماہر ہیں"۔

"لیکن یہ اُس نے کیونکر جانا کہ یہ بیماری مشرقی ہے"۔

"کیونکہ یہ بیماری اُسے اُن چینیوں کے درمیان رہنے سے ہوئی ہے۔ جن کے ساتھ وہ کسی جُرم کی تحقیق میں کام کر رہا تھا"۔

یہ سُن کر کلورٹن مُسکرایا اور بولا "مجھے یقین ہے کہ اس کی بیماری زیادہ اہم نہ ہوگی۔ وہ کب سے بیمار ہے"؟

"تین دن سے"۔

"ہذیانی کیفیت تو ابھی پیدا نہیں ہوئی"؟

"ہوگئی ہے"۔

"تو صُورت بہت نازک ہے اور مجھے جانا چاہیے۔ اچھّا تم باہر انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں"۔

چونکہ ہومز کی ہدایت مجھے یاد تھی اس لئے مَیں نے کہا "مجھے اور ایک جگہ جانا ہے اس لئے آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا"۔

اُس نے یہ سُن کر کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے مَیں اس کے مکان سے واقف ہوں اور میں آدھ گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ جاؤں گا"۔

جس وقت مَیں ہومز کے کمرہ میں داخل ہُوا تو میرا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ خدا جانے اسے کس حالت میں پاؤں لیکن جب میں نے اُسے نسبتاً سکون کی حالت میں پایا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ اُس نے نہایت کمزور آواز میں دریافت کیا کہ کیوں واٹس ملاقات ہوئی؟"

"ہاں وہ آ رہا ہے"۔

"شاباش واٹس! شاباش!! اُس نے پوچھا تھا کہ کیا بیماری ہے؟"

"ہاں اُس نے دریافت کیا اور مَیں نے جواب میں کہہ دیا کہ چینیوں کے ساتھ رہنے سے یہ بیماری لاحق ہوئی ہے"۔

"بیشک تم نے ٹھیک جواب دیا"۔ "اچھا اب تم جا سکتے ہو"۔

"لیکن میں انتظار کرونگا تاکہ اُس کی رائے معلوم کر سکوں"۔

"مگر مَیں چاہتا ہوں کہ وہ تنہا مجھے دیکھے اور آزادی کے ساتھ اپنی رائے دے اس لیئے تم میرے سرہانے کے کمرہ میں چھپ جاؤ اور وہیں سے اُس کی تشخیص سُن لینا"۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھ بیٹھا اور گھبرا کر بولا۔ "واٹس خدا کے لیئے جلد چھپ جاؤ

گاڑی کے پہیوں کی آواز آ رہی ہے جلدی کرو اور کچھ بھی ہو تم نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہنا۔

مَیں نے اُس کے ارشاد کی تعمیل کی اور وُہ پھر بستر پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد زینہ پر قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھُلا۔ مسٹر کلورٹن آ کر ہومز کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اُس کی صُورت دیکھتا رہا اور پھر ہومز کا نام لے کر پکارا جب وُہ نہ بولا تو جھنجھوڑ کر بولا۔ "ہومز کیا تم نہیں سنتے ہو؟"

ہومز نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور بولا آہ، مسٹر اسمتھ کیا تم ہو۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ تم آؤ گے بڑی مہربانی کی۔ کیونکہ اس قسم کے امراض میں تمہاری قابلیت کا مجھے اعتراف ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا بیمار ہو؟"

"وہی بیماری ہے۔"

"کیا تم علامات سے واقف ہو۔"

"خوب واقف ہوں۔"

"ہومز! مجھے تعجب نہیں ہے۔ اگر تمہیں بھی وہی مرض ہو جو وکٹر کو ہو

گیا تھا۔ وُہ چوتھے دن مر گیا۔ حقیقتاً یہ امر بہت تعجّب خیز تھا کہ لندن میں رہ کر اس کو وُہ مرض لاحق ہُوا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ تم بھی اس مرض میں مُبتلا ہو گئے۔“

”لیکن اُس کی بیماری کا سبب تو تم تھے۔“

یہ سُن کر کلورٹن مسکرایا اور بولا۔”تم اسے کس طرح ثابت کر سکتے ہو؟“

ہومز نے یہ سُن کر کوئی جواب نہ دیا اور سراسیمگی کی حالت میں پانی مانگا۔ کلورٹن نے کہا۔”اے میرے دوست تمہارا وقت اخیر آ رہا ہے لیکن چونکہ تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہُوں اس لئے تمہیں پانی دیئے دیتا ہوں تاکہ تم بغیر سُنے مر نہ جاؤ۔“

ہومز نے کہا کہ”مسٹر کلورٹن میرے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ تم مجھے اچھّا کر دو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب کچھ بھلا دُونگا۔“

”کیا بھلا دو گے“؟

”وکٹر کی موت کو جس کے متعلّق تم نے ابھی اقرار کیا کہ تمہیں اس کا باعث ہُوئے تھے۔“

”تم بھلا دو یا یاد رکھّو اب مجھ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمہاری

موت مجھے تمام اندیشوں سے آزاد کر دینے والی ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی اس وقت وکٹر کی موت کا سوال نہیں ہے بلکہ مسئلہ تمہاری موت کا در پیش ہے اور اسی پر گفتگو ہونی چاہئے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ بیماری تمہیں چینی ملاحوں سے لگی۔" ہومز نے کہا کہ "میرا خیال ایسا ہی ہے۔"

وہ یہ سن کر ہنسا اور بولا۔ "کہ تم کو اپنی عقل پر بڑا ناز ہے۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ ہم کو ایسے شخص سے واسطہ پڑا ہے جو بہت زیادہ چالاک ہے۔ اچھا غور کرو۔ تمہیں کچھ خیال ہے کہ تم کیسے بیمار ہوئے؟"

ہومز نے کہا کہ "مجھے بالکل یاد نہیں نہ میرا دماغ اس وقت کام دیتا ہے خدا کے لئے تمہیں بتاؤ۔" اس نے کہا کہ "جس دن اس مرض کی علالت تم کو لاحق ہوئی کوئی خاص واقعہ ہوا تھا؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔"

"پھر غور کرو۔"

"میں خیال کرنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"اچھا تو میں بتاتا ہوں۔ کوئی چیز تمہیں ڈاک کے ذریعہ سے ملی تھی؟"

"ڈاک کے ذریعہ سے؟"

"ہاں، ہاں کوئی صندوقچہ"۔

ہومز کی حالت اس وقت اور زیادہ بگڑ گئی۔ اور اس نے لڑکھڑائی زبان سے کہا کہ "مجھے غش آرہا ہے۔ سنبھالو۔ مَیں مر رہا ہوں"۔

کلورٹن نے ہومز کو جھٹکا دے کر کہا کہ "سنو۔ تمہیں سُننا پڑیگا جو مَیں کہہ رہا ہوں کیا تمہیں خیال نہیں ہے کہ بُدھ کے دن ایک صندوقچہ ہاتھی دانت کا تمہارے پاس آیا تھا اور تم نے اُسے کھولا تھا"

"ہاں۔ ہاں مجھے یاد ہے۔ اس میں اندر کمانی لگی ہوئی تھی۔ یہی وہ صندوقچہ ہے جو میز پر دکھا ہوا ہے"۔

"بلاشک یہی ہے اور اب دیکھو میری جیب میں جا رہا ہے تاکہ میرے خلاف شہادت میں پیش نہ ہو سکے۔ اچھا تو ہومز سنو کہ یہ صندوقچہ میں نے ہی بھیجا تھا اور مَیں ہی تمہاری ہلاکت کا باعث ہوا ہوں۔ اب تم مر رہے ہو اور مَیں اپنا جی خوش کرنے کے لئے یہاں اُس وقت تک انتظار کرونگا جب تک تمہاری سانس ختم نہ ہو جائے۔ چونکہ تم جانتے تھے کہ وکٹر کو مَیں نے ہی ہلاک کیا تھا۔ اس لئے تمہارا ہلاک کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اے میرے عزیز دوست! اب دمِ نزع تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"۔

اس کے جواب میں ہومز نے دیا سلائی اور سگریٹ طلب کیا اور میں یہ سُن کر خوشی کے مارے بے چین ہوگیا۔ کیونکہ ہومز اب اپنی اصلی آواز سے بول رہا تھا گو اس میں ضعف ضرور تھا۔

کلورٹن متعجّب ہوکر کھڑا ہوگیا اور بولا:- "اس کا کیا مطلب ہے"۔ ہومز نے جواب دیا کہ نقل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اصل سے قریب تر ہوجائے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تین دن سے میں نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا اور سب سے پہلے تمہیں نے مجھے پانی کا گلاس دیا۔ سگریٹ کے لئے میں بہت بیتاب تھا۔ سو اب وُہ بھی مجھے مل گیا"۔

یہ کہہ کر اُس نے میز سے سگریٹ لیا اور دیا سلائی سے جلا کر پینے لگا۔ اُس کے بعد ہی دروازہ کُھلا اور انسپکٹر مارٹن اندر داخل ہوا۔ ہومز نے کہا۔ "لیجئے اپنے مجرم کو سنبھالئے یہاں حاضر ہے"۔

مارٹن کلورٹن کی طرف مخاطب ہوا اور بولا کہ "میں تم کو وکٹر کے قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور ہومز نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ مسٹر واٹسن میں تم سے معافی مانگتا ہوں اگر تمہیں میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو۔ میں جانتا تھا کہ اگر حقیقتاً بیماری

کی پوری کیفیت اپنے اُوپر طاری نہ کرونگا تو نہ مسز ہڈسن کو متاثر کر سکونگا اور نہ تمہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ ڈاکٹری کے فن میں تم ماہر ہو۔ لیکن مَیں نے قصداً تمہاری توہین کی تاکہ تم میرا علاج نہ کرو اور مَیں تمہارے ذریعہ سے مسٹر کلوٹن کو بلاؤں جس نے مجھے بیمار ڈالنے اور ہلاک کرنے کے لئے وہ صندوقچہ بھیجا تھا جس کے چھُونے سے مَیں نے تمہیں باز رکھا تھا۔ اس کے اندر کمانی ہے جو ڈھکنے کو زور سے کھولتی ہے اور اندر سے جراثیم سانس کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بھتیجہ کو بھی اسی طرح ہلاک کیا اور مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ وُہ اپنے مقصد میں ناکامیاب ہُوا اور مَیں اس کی گرفتاری اور خود اس کے منہ سے اقرار جرم کرانے میں کامیاب ہُوا۔ مَیں جانتا تھا کہ اس کی فطرت بڑی انتقام جُو ہے اور یہ یقیناً میری بیماری کا حال سنکر آئے گا اور مجھے مرتا ہُوا دیکھ کر خوش ہو گا۔ چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا اور مسٹر کلوٹن یہاں تشریف لائے اور خود ہی نہایت آزادی سے اعترافِ جُرم کر لیا جس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔"

یہ سنکر مَیں نے حیرت سے پُوچھا "خیر یہ تو سب کچھ ہُوا لیکن تم نے اپنی صورت کیسے مریضوں کی طرح بنالی۔"

یہ سن کر وہ ہنسا اور بولا۔ کیا تین دن کا فاقہ کرنے کے بعد انسان کا چہرہ پر رونق رہ سکتا ہے۔ رہا پیشانی کا پسینہ، آنکھ کی سرخی، لبوں کی پپڑی، سو یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ ذرا سا دیسلین ماتھے پر، بلاڈونا کا ایک قطرہ آنکھ میں، اور تھوڑا سا موم لبوں پر کافی تھا۔ میں تم کو اپنے پاس اس لئے نہ آنے دیتا تھا کہ اگر تم نے میری نبض دیکھ لی تو معلوم کر لوگے کہ اچھا خاصا ہوں اور پھر میرا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔"

یہ کہہ کر ہومز نے میرا ہاتھ پکڑا اور کلورٹن کو پولیس کی حراست میں چھوڑ کر میرے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔

(نگار اپریل ۱۹۲۷ء)

# عہدِ عباسیہ کا دورِ زرّیں

مامون الرشید جسے خاندانِ عباسیہ کا گلِ سرسبد کہنا چاہیئے۔ اپنی تمام انسانی و شاہانہ خصوصیات کے لحاظ سے جیسا عدیم النظیر اور فقید المثال خلیفہ گزرا ہے اس کا حال ہر اُس شخص پر روشن ہے جس نے سرسری نگاہ سے بھی اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی مجالس فضل و کمال، اس کی سطوتِ شاہانہ اس کی ہنر پروری، اس کی علم نوازی اور اس کی حیاتِ شعری کے حسین مناظر اسی کے ساتھ ختم ہو گئے اور ایسا ہونا چاہیئے تھا کیونکہ عہدِ عباسیہ کا دورِ زرّیں جس کی ابتدا ہارون الرشید سے ہوتی تھی۔ اس قدر سُرعت کے ساتھ تکمیلِ حسن کے مناظر پیش کر رہا تھا اور

مامون الرشید نے انہیں اُس نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا کہ دوسرے آنے والے خلیفہ کے لیئے اس میں کسی اضافہ کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہ گئی تھی

مامون الرشید کا اپنے وزیر حسن بن سہل کی لڑکی بوران سے شادی کرنے کا واقعہ، ہر مورّخ نے بیان کیا ہے اور جس شوکت و اہتمام کے ساتھ اقتران عمل میں آیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد مامون میں مسلمانوں کی دولت اور ان کی معاشرت کس قدر ترقی کر گئی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اور عجیب و غریب واقعہ وہ ہے جسے دربارِ مامون کے مشہور مغنّی اسحاق موصلی نے بیان کیا ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مامون نے بوران کو کب اور کیونکر دیکھا۔

اس واقعہ کو صاحب عقد الفرید اور ابو الفرج اصفہانی صاحب الاغانی نے نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے اور ابن خلدون نے اس کی تردید کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابن خلدون کی مورخانہ تنقید کے مقابلہ عقد الفرید یا الاغانی کی روایت کو صحیح نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسحٰق کی اس روایت سے کم از کم یہ ضرور پایۂ تحقیق کو پہنچتا ہے کہ اس وقت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کیا رنگ تھا۔ اس وقت کی معاشرت کیسی تھی۔ اور نیز یہ کہ اس عہد میں عورتوں

کی مجالسِ ادب کیسی رنگین، کیسی فاضلانہ، اور اسی کے ساتھ کیسی عفیف اور اچھوتی ہوا کرتی تھیں۔ اُمیّد ہے کہ ناظرین اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔

---

اسحٰق موصلی کا بیان ہے کہ ایک دن میں خلیفہ مامون کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور خلیفہ بہت مسرور و شاداں نظر آرہا تھا۔ دفعتہً اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اے اسحٰق! آج کا دن لطف و مسرّت کا دن ہے"۔

میں نے عرض کیا "اے امیر المومنین! خدا اس عیش و مسرّت کو مبارک کرے اور دوام بخشے"۔

اس کے بعد خلیفہ نے غلاموں کو مخاطب کر کے کہا کہ "دروازہ بند کرو اور شراب لاؤ"۔ یہ کہہ کر خلیفہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرہ میں لے گیا جہاں تمام ضروری اسبابِ تفریح موجود تھے۔ یہاں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب دورِ شراب شروع ہوا تو چاروں طرف سے حسین و جمیل کنیزیں مختلف قسم کے سازِ موسیقی لے کر نمودار ہوئیں اور یہ محفلِ نشاط شام تک برپا رہی جب آفتاب غروب ہوا تو خلیفہ نے مجھ سے کہا "اے اسحٰق جوانی کے بہترین ایّام وہی ہیں جو عیش و طرب میں بسر ہو جائیں"۔ میں نے جواب دیا "امیر المومنین

کا ارشاد بالکل درست ہے"۔ اس کے بعد خلیفہ بولا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ رات بھی اسی لطف میں بسر ہو جائے اور اب میں حرم میں جانا چاہتا ہوں تم یہیں رہو میں تمہیں جلد یاد کر لونگا"۔ یہ سنکر میں نے سرِ اطاعت خم کر دیا اور خلیفہ اُٹھ کر دار السلام میں داخل ہو گیا۔

اسحٰق کا بیان ہے کہ جب رات زیادہ گزر گئی اور مجھے یاد نہ کیا گیا تو میں سمجھا کہ خلیفہ مجھے بھول گیا اور میں گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ خدام نے پُوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ خلیفہ اس وقت عیش و عشرت میں منہمک ہے۔ مجھے کیوں یاد کرنے لگا۔ علاوہ اس کے وقت بھی گزر گیا ہے اور وہ اب مجھے نہ بلائیگا"۔

یہ کہہ کر میں دروازہ سے نکلا تو حاجبوں نے کہا کہ "آپ کے غلام سواری لے کر آئے تھے لیکن جب زیادہ دیر ہو گئی تو واپس گئے اگر حکم ہو تو خاصہ کی سواری منگوائی جائے۔ میں نے کہا "کوئی حرج نہیں۔ پیادہ پا چلا جاؤنگا۔ انہوں نے مشعل لانے کو کہا میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

میں راستہ سے گزر رہا تھا کہ مجھے حاجت محسوس ہوئی۔ اس لئے ایک گلی میں ہو گیا۔ وہاں دیکھا کہ کوئی چیز ایک مکان کی دیوار سے ملی ہوئی لٹک

رہی ہے۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ ایک زبیل ہے جس
میں چار قبضے دیباج سے منڈھے ہوئے لگے ہیں اور ان میں چار ریشمی ڈوریاں
بندھی ہوئی ہیں۔ میں دیر تک اس پر غور کرتا رہا اور آخر کار جسارت سے کام
لے کر اس زبیل میں بیٹھ گیا۔ میرا زبیل میں بیٹھنا تھا کہ اس میں حرکت پیدا
ہوئی اور میں اُوپر کی طرف چلا۔ لبِ بام پہنچکر میں نے دیکھا کہ چار کنیزیں کھڑی
ہوئی ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا "تم واقف الحال ہو یا نئے آدمی"؟ میں نے
کہا کہ میں تو نیا آدمی ہوں۔" یہ سُن کر انہوں نے ایک اور کنیز کو آواز دی کہ
"شمع لاؤ۔"

جب میں مکان میں داخل ہُوا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ سوائے
حسن و نظافت کے وہاں کوئی چیز اور نظر ہی نہ آتی تھی۔ نہایت مکلّف فرش
بچھا ہُوا تھا۔ جا بجا مسندیں آراستہ تھیں اور یہ تمام سامان اس قدر قیمتی تھا کہ
سوائے دار الخلافت کے کہیں اور پایا نہیں جا سکتا تھا۔ میں وہاں سب سے
ادنیٰ جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دفعتہً مکان کے ہر چہار طرف سے ہنگامہ حیات
کے آثار نمودار ہونے لگے اور حسین و جمیل کنیزوں کی آمد شروع ہوئی۔ جن میں
سے بعض کے ہات میں شمعیں تھیں اور بعض مجمر لئے ہوئے تھیں جن سے عود و

مشک کی خوشبو بلند ہو رہی تھیں۔ انہیں کنیزوں کے درمیان ایک نوجوان لڑکی جو عاج کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، مستانہ وار جھومتی چلی آتی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر میرا خیر مقدم ادا کیا اور دریافت کیا کہ میں کیسے غیر متوقع طور پر یہاں پہنچ گیا۔ میں نے جواب دیا کہ "میں اپنے بعض احباب کے پاس سے تنگ وقت میں اُٹھ کر چلا تو اس راستہ سے گزرنا ہو گیا۔ میں نے ایک زمبیل معلق دیکھی چونکہ نبیذ کے نشہ سے چُور تھا۔ اس لئے اس زمبیل میں بیٹھ گیا۔ اگر یہ غلطی تھی تو قصور نبیذ کا تھا اور اگر غلطی نہ تھی تو خدا کی طرف سے الہام تھا۔" اس نے کہا "کوئی حرج نہیں لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کا پیشہ کیا ہے۔" جواب دیا کہ "میں بزاز ہوں"۔ اس نے پوچھا "کس طبقہ سے آپ کا تعلق ہے۔" میں نے کہا "طبقۂ اوسط سے"۔ اس نے کہا کہ اگر کچھ اشعار یاد ہوں تو سُنایئے۔" میں نے کہا کہ "کچھ تو یاد ہیں لیکن اجنبی ہوں اور وحشت میں مُبتلا، پہلے آپ شروع کیجئے تاکہ میری وحشت دُور ہو۔"

اس کے بعد اُس نے قدیم و جدید شعراء کا کلام اور ان کے بہترین اقوال سُنانے شروع کئے۔ میں حیران تھا کہ اس کے حافظہ کی داد دُوں یا حسنِ انتخاب کی، اس کے ادا کرنے کی خوبی کو سراہوں یا اس کے اوزانِ شعر کی معرفت

کو، جب وہ اس سے فارغ ہوئی تو پھر مجھ سے اصرار کیا اور مَیں نے بھی مختلف شعراء کے اشعار اور دلچسپ حکایات و واقعات سنائے جس سے وہ مسرور ہوئی اور بولی کہ "طبقۂ تجار میں کسی کا ایسا صاحبِ علم و معرفت ہونا تعجب انگیز ہے۔ مَیں نے کہا کہ "مجھے ان چیزوں کے مطالعہ کا موقع مل گیا تھا۔ اس لئے کچھ دماغ میں محفوظ رہ گیا۔"

اس کے بعد دسترخوان بچھا اور نہایت ہی لطیف اور پاکیزہ کھانے چُنے گئے۔ مَیں کھاتا جاتا تھا اور اس کے ذوق کی پاکیزگی اور حُسنِ ادب پر حیرت کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد نبیذ کا سامان لایا گیا۔ میرے سامنے ایک چینی میں بلوری جام و مینا رکھ دیا گیا۔ وسطِ مجلس میں پھولوں کے گلدستے رکھ دیئے گئے اور عجیب و غریب میوے چُنے گئے۔ یہ تمام سامان اس قسم کا تھا کہ سوائے خلیفہ اور اس کے ولی عہد کے کسی کو میسّر نہ آسکتا تھا۔

وہ بولی کہ اب وقت تفریح و گفتگو کا ہے۔ کچھ کہئے۔" مَیں نے بعض نہایت دلچسپ تاریخی واقعات سُنائے جن کو سُن کر وہ بہت مسرور ہوئی اور بولی کہ "طبقۂ تجار میں ایسے قابل افراد کا پایا جانا عجیب بات ہے۔" مَیں نے کہا کہ "میرا ایک پڑوسی بعض ملوک کا ندیم رہا ہے۔ اوقاتِ فرصت اسی کے پاس

بسر ہوتے تھے اس لئے مجھے بھی سلیقہ گفتگو کا حاصل ہو گیا۔"

اس کے بعد دورِ شراب شروع ہوا۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ نبیند کے دور چل رہے تھے اور رات اس لطف میں گزر رہی تھی کہ وہ بولی "میں تمہیں ہر بات میں کامل پاتی ہوں لیکن صرف ایک موسیقی کی کمی ہے۔ اگر اس سے آگاہی ہو تو کیا کہنا" میں نے جواب دیا کہ "مجھے کسی وقت اس کا بڑا شوق تھا اور کوشش بھی سیکھنے کی کی۔ لیکن جب میں اس میں کوئی ترقی نہ کر سکا تو چھوڑ دیا لیکن سننے کا اشتیاق بہت ہوں۔" یہ سن کر اس نے عود منگایا اور گانا شروع کیا۔ اس کی موسیقی کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں سارے مکان پر وجد کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ وہ ہر چیز نہایت باقاعدہ اور پوری صحت کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ پھر خود ہی اس نے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کس کا گانا ہے۔" میں نے کہا "مجھے تو معلوم نہیں"۔ اس نے کہا کہ "یہ اسحٰق موصلی کا ہے"۔

الغرض ساری رات اسی لطف میں بسر ہوئی۔ جب صبح کا وقت ہوا تو ایک ضعیفہ آئی اور اس نے کہا کہ "اے بیٹی وقت ختم ہو گیا"۔ یہ سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے نہایت تہذیب کے ساتھ رخصت کیا۔

گھر پہنچکر میں نے نماز پڑھی اور سو جانا چاہا۔ لیکن ابھی سر تکیہ پر رکھا ہی

تھا کہ خلیفہ کے چوبدار آئے اور مجھے لے گئے میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے کہا "اے اسحٰق! کیا تم ہم سے بیزار ہو گئے؟"

میں نے عرض کیا کہ "اے امیر المومنین میرے لئے اس سے زیادہ کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ خدمت میں حاضر رہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں نے ایک لونڈی خریدی ہے اور اس میں جی لگا رہتا ہے۔ رات جب امیر المومنین نے مجھے طلب نہ کیا تو مجھے اس کا خیال آیا اور چلا گیا۔" یہ سن کر خلیفہ نے پوچھا "کیا کل کی سی صحبت پھر برپا کی جائے؟" میں نے عرض کیا کہ "اے امیر المومنین ایسی صحبت سے کس کو عذر ہو سکتا ہے۔"

چنانچہ پھر وہی صحبت برپا ہوئی اور خلیفہ پھر مجھے منتظر کر کے حرم میں داخل ہو گیا۔ میں نے جانا چاہا تو غلاموں نے روکا لیکن میں انہیں کسی طرح مطمئن کر کے پھر زنبیل میں بیٹھ کر اسی مکان میں پہنچا اور ساری رات اسی لطف میں بسر کر کے گھر پہنچ گیا۔

گھر پہنچا ہی تھا کہ خلیفہ کے چوبدار پھر مجھے لے گئے اور خلیفہ مامون آج مجھ پر برہم ہوا۔ میں نے پھر اپنی مجبوری ظاہر کر کے معافی چاہی اور مامون نے معاف کر کے پھر وہی بزم نشاط مرتب کر کے مجھے اس میں شریک کیا۔ اور بعد کو حرم

میں داخل ہو گیا لیکن اس مرتبہ سخت تاکید کر دی کہ "جانا نہیں"۔

میں سمجھتا تھا کہ اس مرتبہ اگر میں نے حکم سے عدول کیا تو خیر نہیں لیکن اسی کے ساتھ جب گزشتہ دو راتوں کے لطفِ صحبت کا خیال آتا تھا تو جی تڑپ اُٹھتا تھا۔ آخر کار تمام مصالح کو نظر انداز کر کے حاجبوں اور غلاموں کو سمجھا بجھا کر پھر وہیں پہنچ گیا۔

اس مرتبہ جب رخصت کا وقت آیا تو مجھے خیال آیا کہ اب مامون کو سارے حال سے آگاہ کیئے بغیر جان نہیں بچ سکتی تھی اس لئے میں نے اس خاتون سے کہا کہ "میرا ایک عم زاد بھائی ہے اور وہ فنون شعر و ادب کے علاوہ موسیقی کا بھی ماہر ہے۔ اگر اجازت ہو تو کل اُسے لیتا آؤں"۔ اُس نے نہایت لطف سے اس کی اجازت دے دی اور میں گھر چلا آیا۔ لیکن ابھی ضروریات سے فارغ نہ ہوا تھا کہ خلیفہ کے آدمی آئے اور مجھے لے گئے۔ سامنے حاضر ہوا تو روح خشک ہو گئی۔ کیونکہ آج وہ بہت غضب آلود تھا۔ میں نے جاتے ہی عرض کیا کہ "غلام کا ماجرا پہلے خلوت میں سُن لیا جائے۔ اس کے بعد کوئی حکم نافذ کیا جائے"۔ میرے اس کہنے پر خلوت ہو گئی اور میں نے سارا حال مامون الرشید کو سُنایا۔ مامون سُن کر بہت بیتاب ہوا اور بولا کہ مجھے بھی وہاں لے چلو۔ میں نے

کہا "یہ کیونکر ممکن ہے" اُس نے کہا "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا"

آخر کار شام ہوئی اور میں خلیفہ کو لے کر اس گلی میں پہنچا۔ آج بجائے ایک کے دو زنبیلیں معلّق تھیں۔ ہم دونوں بیٹھ کر اُوپر پہنچ گئے۔ مامون نے جب مکان کی آرائش اور وہاں کے سامان کو دیکھا تو حیران رہ گیا کہ یہ کس کا مکان ہو سکتا ہے۔ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا اور مامون کو اپنی مسند سے ذرا نیچے جگہ دی۔ جب وُہ خاتون آئی تو اُس نے مامون کو اُٹھا کر صدر میں بٹھایا اس حال میں کہ مامون اس کے حُسن سے بالکل مسحور ہو چکا تھا۔

اس کے بعد لطفِ صحبت شروع ہوا۔ اور وُہ مامون کی فاضلانہ و ادیبانہ گفتگو سے بہت مسرور ہوئی اور مجھے وعدہ یاد دلایا۔ میں نے کہا کہ "ہاں یہ بھی سنائیں گے لیکن پہلے آپ سنائیے"۔ اس نے عود لے کر گانا شروع کیا اور ہم لوگوں نے نبیذ کا شغل، جب مامون پر نشہ چڑھ گیا تو دفعتہً بے اختیار ہو کر بول اُٹھا کہ "اے اسحٰق" اور وُہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے شیر اپنے شکار کو دیکھے۔ میں نے کہا "لبّیک یا امیرالمومنین"۔ اس نے کہا کہ "اس چیز کو تو گا کر سنا"۔ یہ سنتے ہی میں نے عود لیا اور وُہ خاتون حقیقتِ حال معلوم کر کے فوراً پردہ میں چلی گئی۔

جب میں گانے سے فارغ ہوا تو خلیفہ نے کہا کہ "دریافت کرو یہ کس کا مکان ہے"۔ میں نے جاکر اُس ضعیفہ سے پُوچھا تو اُس نے کہا کہ یہ حسن بن سہل کا مکان ہے اور یہ خاتون اس کی لڑکی بوران ہے"۔ میں نے آکر خلیفہ سے عرض کیا۔ خلیفہ نے کہا کہ اب اس واقعہ کا ذکر تم کسی سے نہ کرنا"۔

جب صبح ہوئی اور حسن بن سہل حاضر ہوا تو مامون نے اس سے کہا کہ تمہارے کوئی لڑکی ہے"؟ حسن نے جواب دیا کہ "ہاں اے امیرالمومنین"! مامون نے پوچھا۔ "اس کا کیا نام ہے"؟ حسن نے جواب دیا۔ "بوران"۔ مامون نے کہا کہ "میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں"۔ حسن بولا کہ وہ امیرالمومنین کی کنیز ہے مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔ خلیفہ نے کہا کہ میں ۳۰ ہزار دینار مہرِ معجل پر اسے اپنے نکاح میں لیتا ہوں"۔ اور اس طرح مامون الرشید کا عقد بوران سے عمل میں آگیا۔

اسحٰق موصلی کا بیان ہے کہ میں نے اس واقعہ کو مامون کی زندگی میں کسی سے نہیں کیا اور میں اپنی زندگی کی وہ چار راتیں کبھی نہیں بُھول سکتا جو بوران کے مکان پر بسر ہوئیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس نے یہ فضل و کمال مختلف ادیبوں اور کاملینِ فن کے فیضِ صحبت سے حاصل کیا تھا۔ لیکن اس

کی یہ تمام صحبتیں ایسی پاکیزہ ہوتی تھیں کہ کبھی کسی مکروہ بات کا ذکر بھی درمیان میں نہ آتا تھا۔ یہ معلوم کرکے بعد ان کی عزت میرے دل میں بہت بڑھ گئی اور اس کے اس شرف کا میں نے ہمیشہ احترام کیا۔

نگار دسمبر ۱۹۲۴ء

# نپولین کی زندگی کا ایک پوشیدہ ورق

جب نپولین ۱۸۰۷ء کے مشہور عہد نامۂ صلح کے بعد پیرس واپس آیا تو وہ بے انتہا مسرور تھا اور اس کا اقبال انتہائی عروج پر، کیونکہ مسلسل تین جنگوں میں وہ تین سلطنتوں کو شکست دے کر سارے یورپ کو لرزہ براندام کر چکا تھا۔

اس کے اوقات اس زمانہ میں زیادہ تر ملکہ کے پاس یا دربار میں صرف ہوتے تھے اور تمام خستہ فوجیں جو میدانِ کارزار سے واپس آئی تھیں نہایت لطف و راحت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔

ایک دن میں اپنے کوارٹر میں بیٹھا ہوا ایک دوسرے افسر کے ساتھ

تماشہ کھیل رہا تھا کہ دفعتہً ہمارا کرنل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے اور اُس نے بڑھ کر میرے شانہ پر ہاتھ رکھا اور بولا کہ "آج چار بجے شام کو بادشاہ نے تمہیں یاد کیا ہے۔"

یہ سُن کر میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ سارا کمرہ گردش میں ہے اور میرے تمام ہاتھ پاؤں کی قوت سلب ہو گئی ہے۔ میں نے حد درجہ متحیر ہو کر کہا بادشاہ اور مجھے.....؟"

کرنل نے جواب دیا کہ "ہاں۔ ہاں تمہیں کو بلایا ہے۔"

میں نے کہا کہ "بادشاہ کو تو میرے وجود کا بھی علم نہیں اس لئے وہ مجھے کیوں بلانے لگا۔"

کرنل بولا کہ "خود مجھے بھی حیرت ہے۔ لیکن ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جسے انتہائی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ تمہارے لئے یہ وقت آ گیا ہو۔ اب تردد کیا ہے۔ جاؤ اور مسرت یا غم جو کچھ بھی ہو اس کو مردانہ وار قبول کرو۔"

اب دو بجے تھے۔ اس لئے وہ وقت مقررہ پر آنے اور محفل شاہی تک لے جانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس دو گھنٹہ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جو

اِس طلبی کا سبب و نتیجہ سمجھنے کی ادھیڑ بُن میں صرف نہ ہُوا ہو۔ لیکن باوجود تمام سعی کے کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور مطلقاً یہ امر سمجھ میں نہ آیا کہ بادشاہ کو میرے وجود کا علم کیونکر ہُوا۔ گزشتہ جنگوں کے جملہ واقعات اور اپنے تمام کارناموں پر حافظہ کی مدد سے کام لے کر تنقیدی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ بہت سی اچھی باتیں بھی تھیں اور بہت سی بُری بھی۔ اس لیے کون کہہ سکتا تھا کہ بادشاہ نے مجھے انعام دینے کے لیے بُلایا ہے یا سزا دینے کی غرض سے۔ لیکن جب میں اس حقیقت پر غور کرتا تھا کہ آج تک کبھی مجھ سے بُزدلی، سرکشی اور غدّاری کی خطا سرزد نہیں ہوئی تو فی الجملہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ اگر سزا بھی دی گئی تو کم از کم میرے ضمیر کو داغدار بنانے والی نہ ہو گی۔"

مَیں اسی فکر میں مبتلا تھا کہ ٹھیک ساڑھے تین بجے لکڑی کے زینے پر جو میرے مکان کے دروازے پر قائم تھا کرچ کے کھڑکنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحہ میں کرنل ایک اور شخص کے ساتھ جو اپنی وضع سے دربار کا امیر معلوم ہوتا تھا اندر داخل ہُوا۔ مَیں نے اُٹھ کر باقاعدہ فوجی سلام کیا اور کرنل نے جواب دے کر اپنے ساتھی کا تعارف کرایا جو تالیراند تھا اور نپولین کے بعد فرانس کا سب سے بڑا شخص۔

اس نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تم نے لفٹننٹ جرارڈ سے یہ بھی بتا دیا ہے کہ بادشاہ کے بلانے کا کیا سبب ہے؟"

کرنل نے کہا کہ "ابھی تک میں نے نہیں بتایا۔ لیکن اب بتائے دیتا ہوں" اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آج صبح میں بادشاہ کے خاص کمرہ میں حاضر تھا کہ ایک لفافہ اس کو لا کر دیا گیا۔ اس نے کھولا اور پڑھا اور پڑھتے ہی اس پر سکتہ طاری ہو گیا اور اطالوی زبان میں آپ ہی آپ کوئی فقرہ اس نے کہا جس کو میں نہیں سمجھ سکا۔ اس کے بعد وہ بیٹھ گیا اور آدھ گھنٹہ تک بالکل بے حس و حرکت بنا رہا۔

اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولا کہ "تمہاری فوج میں کوئی بہادر افسر بھی ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "سبھی بہادر ہیں"۔ اس نے کہا کہ "تم ایسے شخص کا انتخاب کرو جو صرف کام کرنا جانتا ہو اور سوچنے والا کم ہو۔ تم غالباً میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے"۔ میں نے کہا کہ "ہاں ایک آدمی ایسا ہے جس کی دنیا تلوار اور گھوڑے کے علاوہ کچھ نہیں ہے"۔ یہ سن کر بادشاہ نے فرمایا کہ "اس کو ٹھیک چار بجے حاضر کرو"۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آیا اور تمہیں فرمانِ شاہی سے آگاہ کر دیا"۔

جب کرنل اپنی یہ تقریر ختم کر چکا تو تالیراند نے مجھ سے کہا کہ "میری ایک نصیحت سن لو اور وہ یہ ہے کہ ہر چند مجھے یا تمہارے کرنل کو اس کا مطلق علم نہیں کہ بادشاہ نے تمہیں کیوں یاد کیا ہے لیکن ملک اور قوم کے فائدہ کے لئے اس کا علم ہم لوگوں کو ہو جانا ضروری ہے اس لئے ہم دونوں یہاں تمہارے منتظر رہیں گے"۔

اس وقت میں نہ کسی کی نصیحت سننے کے حال میں تھا اور نہ یہ سمجھنے کے قابل کہ اس پر عمل کرنا چاہیئے یا نہیں۔ وقت قریب تھا۔ اس لئے میں روانہ ہو گیا اور چونکہ قصرِ شاہی یہاں سے صرف ۱۰۰ قدم کے فاصلہ پر تھا۔ اس لئے جلد ہی پہنچ بھی گیا۔ میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ بادشاہ کے حضور میں اطلاع دی گئی اور اسی وقت اندر بلا لیا گیا۔

میں نے جنگ کے دوران میں نپولین کو صدہا مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن یوں اتنے سامنے ہو کر دیکھنے کا موقعہ کبھی نہ ملا تھا۔ میں سنا کرتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خاص بات ہے اور آج اس کا تجربہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان آنکھوں سے وہی خاص چیز نکل نکل کر دل میں گھسی جا رہی ہے اور جسم پر کپکپی طاری کر رہی ہے اس نے مجھے دیکھا اور ہاتھ سے دروازہ ہی پر کھڑے

رہنے کا اشارہ کیا کیونکہ وُہ اپنے سیکریٹری کو کچھ تحریر کرا رہا تھا جب وہ سیکریٹری کو رخصت کر چکا تو میری طرف متوجّہ ہوا۔ مَیں فوراً ایک سپاہی کی طرح تن کر داہنے ہاتھ کو اپنی پیشانی پر لے گیا اور بایاں ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھ کر مجسمہ کی طرح کھڑا رہ گیا۔

وُہ آگے بڑھا اور اپنی انگلی کی نوک میرے سینہ پر رکھ کر بولا کہ "تمہارے کرنل نے مجھ سے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔" مَیں نے چاہا کہ کوئی جواب دوں لیکن یہ خیال کر کے کہ وُہ کسی بات کا جواب سننا پسند نہیں کرتا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔

اُس نے پھر کہا۔ "مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تم تلوار چلانا خوب جانتے ہو۔ اور تمہاری رجمنٹ نے دوسری رجمنٹ کے مقابلہ میں تمہیں کو شمشیر زنی کیلئے منتخب کیا تھا۔"

مَیں نے عرض کیا کہ "ہاں میرے ساتھیوں نے مجھی کو یہ عزت بخشی تھی۔" یہ سننے کے بعد اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا کہ "اگر میرے افسر یونہی باہم جنگ کر کے اپنی قوّت کو ضائع کرتے رہے تو میں یورپ کا مقابلہ کر چکا۔ یاد رکھّو اگر آئندہ مَیں نے کبھی سُنا کہ تم لوگ آپس میں لڑتے ہو تو ان انگلیوں

سے پلیس کر رکھ دوں گا۔"

جس وقت وُہ یہ کہہ رہا تھا اس کا سپیدہاتھ میری نگاہوں کے سامنے چمک رہا تھا اور اُس کی آواز شیر کی سی ہلکی گرج ہوکر کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ وُہ یہ کہہ کر اپنی میز کی طرف گیا اور قہوہ کی پیالی پی کر پھر واپس آیا۔ لیکن اب وُہ طوفان گزر گیا تھا۔ اور اس کے لبوں پر خفیف سا تبسّم نمودار تھا۔ اُس نے کہا:۔

"مسٹر جرارڈ! مجھے تمہاری تلوار کی مدد کی ضرورت ہے لیکن یہ یاد رہے کہ جو کچھ مَیں تم سے کہہ رہا ہوں اس کی خبر تک کسی کو نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی لحاظ رہے کہ مجھے تمہاری رائے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف تعمیلِ حکم چاہتا ہُوں۔ مَیں صرف تمہاری تلوار سے کام لینا چاہتا ہوں۔ دماغ سے نہیں۔ تم نے سُنا؟"

میں نے سر جھکا دیا پھر اُس نے دریافت کیا" تم جنگل کے اندر اُس کنج کو جانتے ہو جو کنج چانسلر کے نام سے مشہور ہے۔" مَیں نے پھر سر جھکا دیا اُس نے پھر پُوچھا کہ تم اُس صنوبر کے درخت کو بھی جانتے ہو جو وہاں قائم ہے۔"

جب مَیں نے یہ سُن کر بھی سر کے خم سے اپنے واقف ہونے کو ظاہر کیا تو اُس نے کہا کہ" اچھّا آج دس بجے رات کو تم مجھے وہاں ملوگے پھر ہم دونوں جنگل کے

اندر داخل ہو نگے۔ لیکن تمہارے پاس سوائے تلوار کے اور کوئی چیز نہ ہونی چاہیے۔ تم مجھ سے کوئی گفتگو نہ کرو گے اور خاموش میرے ساتھ چلو گے۔ اگر کسی درخت کے نیچے تمہیں ایک یا دو آدمی نظر آئیں اور میں تمہیں اشارہ کروں تو اپنی تلوار نکال لینا اور اگر میں ان سے گفتگو کرنے لگوں تو تم خاموش سنتے رہنا لیکن بہر نوع یہ خیال رہے کہ تلوار نکال لینے کے بعد اس وقت تک نیام میں نہ رکھنا جب تک دونوں آدمیوں کے خون سے تم اچھی طرح اُس کو رنگین نہ کر لو۔ میں بھی تمہاری مدد کرونگا۔"

میں نے کہا "یقیناً دو آدمی میری تلوار سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ لیکن اگر حکم ہو تو ایک ساتھی اور لے چلوں۔ تاکہ بادشاہ کو کوئی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔"

یہ سُن کر اُس نے کہا کہ "میں بادشاہ ہونے سے قبل سپاہی ہی تھا اور پھر میں نے تم کو حکم نہیں دیا کہ تمہارا کام صرف تعمیل کرنا ہے۔ مشورہ دینا نہیں؟ اچھا جاؤ اب مجھے کوئی ہدایت کرنا نہیں ہے۔" میں دروازہ تک گیا اور وہاں پہنچکر ایک خاص خیال میرے ذہن میں آیا تو واپس آگیا اور بولا کہ "میں نے یہ سوچا ہے کہ ۔۔۔۔" یہ سنتے ہی نپولین ایک خونخوار شیر کی طرح میری طرف

جھپٹا اور بولا "سوچا! یہ سوچنا کیسا؟ میں نے تجھے سوچنے کے لئے منتخب کیا ہے؟ اب اگر میں نے معلوم کیا کہ تو سوچنا بھی جانتا ہے تو مجھ کو بغیر سوچے ہوئے ایک نتیجہ پر پہنچ جانا ہے۔ چلو ہٹو، اور ٹھیک دس بجے مقررہ مقام پر مجھے ملو۔"

جس وقت میں باہر آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے عذاب سے نجات ملی ہے۔ گھر پہنچا تو کرنل اور تالیراند دونوں موجود تھے۔ تالیراند نے سب سے پہلے مجھ سے یہی سوال کیا کہ بادشاہ نے کیا کہا؟ لیکن میں نے بتانے سے قطعی انکار کر دیا اور ہر چند اُس نے مختلف طریقوں سے مجھے سمجھایا لیکن میں تو سمجھنے اور سوچنے کی قسم ہی کھا چکا تھا۔ اس لئے میں نے ایک نہ سُنی اور اُسے مایوس ہو کر جانا پڑا۔"

میں نے شام سے رات کے دس بجے تک کا وقت جس اضطراب سے بسر کیا اُس کا اندازہ مشکل ہے آخر کار جب وقت قریب آیا تو میں نے اوورکوٹ پہنا۔ کمر سے تلوار لگائی۔ اور جنگل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات تھی۔ لیکن جنگل ایسا گھنا تھا کہ اس کی تاریکی کو چاند کی روشنی زائل نہ کر سکتی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں عالم ارواح

میں پہنچ گیا ہوں جہاں پتّوں کی سرسراہٹ بھی ایک ہولناک چیخ ہو کر کانوں تک پہنچتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر مقررّہ درخت کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ نپولین وہاں پہلے سے موجود ہے۔ میں اُس سے چار قدم کے فاصلہ پر مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید مجھے دیر ہو گئی ہے اور اب وُہ برہم ہو گا لیکن میرے پہنچنے کے بعد ہی دس بجنے کی آواز آئی اور میں مطمئن ہو گیا۔

نپولین تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور بغیر کچھ بولے ہوئے آہستہ آہستہ جنگل کے اندر ہو لیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ایک میل سے زائد چلنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں کا ذکر نپولین نے کیا تھا اور جہاں ایک درخت کے نیچے دو آدمی ہمارے منتظر نظر آ رہے تھے۔

نپولین نے پیچھے پھر کر مجھے دیکھا اور اپنی رفتار کو سُست کر دیا۔ یہاں تک کہ میں اس سے ایک ہات کے فاصلہ پر آ گیا۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک لانبے قد کا تھا اور دوسرا پستہ قامت۔ دونوں سیاہ لبادے پہنے ہُوئے تھے اور ان کی بڑی بڑی سیاہ ٹوپیاں چہرہ کو چھپائے ہوئے تھیں لیکن اُن کی آنکھوں کی چمک ہم تک پہنچ رہی تھی۔

میری توجہ زیادہ تر لانبے آدمی کی طرف تھی کیونکہ وُہ مجھ سے قریب تر تھا۔ دوسرا آدمی کسی خاص جوش سے ایسا ہانپ رہا تھا۔ جیسے کتّا تھک کر ہانپنے لگتا ہے۔ مَیں ان دونوں کی حالت پر غور کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ سیٹی کی آواز آئی اور لانبا آدمی حملہ کرنے کے لئے جُھکا لیکن قبل اس کے کہ وُہ حرکت کرتا مَیں اُس کے سامنے تھا اور میری تلوار اُس کے سینے میں۔ مگر میری نگاہ دوسری طرف پلٹی ہی تھی کہ دوسرے آدمی نے اُچھل کر اپنا خنجر نپولین کے سینہ میں پیوست کر دیا اور وُہ زمین پر گر پڑا۔

اس وقت جو میرے دل کی حالت تھی کسی طرح بیان نہیں ہوسکتی۔ اسی ایک لمحہ کے اندر جذبات و خیالات کی دُنیا میرے دماغ میں سما گئی اور آنکھوں کے سامنے تاریکی سی تاریکی نظر آنے لگی۔ لیکن جس وقت نپولین کی لاش کو مَیں نے دیکھا کہ پُورا خنجر اس کے سینہ میں پیوست ہو چکا تھا اور قاتل فرطِ مسرّت سے اس کے سامنے کھڑا تھا تو پھر مَیں حواس میں آیا اور اپنی تلوار اس کے ساتھی کے سینہ سے نکال کر اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن وُہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حال میں کہ مَیں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا اس میں شک نہیں کہ وُہ مجھ سے زیادہ تیز دوڑنے والا تھا۔

لیکن میری حالت بھی اس وقت ایسی تھی گویا میرے پر لگ گئے تھے اور برابر اُڑا جا رہا تھا۔ کامل آدھ گھنٹہ تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک نالہ پر پہنچکر وُہ میری نگاہ سے غائب ہوگیا۔ یہ وقت میرے لئے نہایت تکلیف کا تھا کیونکہ میں اس شخص کو ہلاک کرنے کا عزم کرچکا تھا اور اب وُہ دفعتہً میرے ہات سے نکلا جا رہا تھا۔ اس نالہ کے دوسری طرف مزدوروں کا سامان رکھنے کے لئے ایک جھونپڑا بنا ہوُا تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ وُہ یقیناً اسی کے اندر چھُپ گیا ہے۔ چنانچہ مَیں بھی اُڑ کر اُس کے دروازہ پہنچا اور دیوانہ وار اندر داخل ہوُا۔ مَیں نے اس کے ہانپنے کی آواز سُنی اور اُسی آواز پر کونہ کی طرف جاکر تاریکی ہی میں اُس پر حملہ کردیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس نے مجھ سے اس وقت ایک درندہ کی طرح مقابلہ کیا۔ لیکن جس جوش کے ساتھ مَیں مقابلہ کر رہا تھا وُہ اس میں مفقود تھا۔ کیونکہ وُہ اپنا مقصود حاصل کرچکا تھا اور مَیں اُس کے حصول کے لئے بیتاب تھا۔ آخر کار جب مَیں نے دیکھا کہ میری تلوار کام کرچکی ہے اور وُہ سرد ہوکر زمین پر گر پڑا ہے تو مَیں پھر باہر آیا۔

جب میرا جذبۂ انتقام فرد ہوچکا تو سوچنے میں مصروف ہوگیا اور

خدا معلوم کن کن خیالات میں محو ہو گیا۔ "بادشاہ مر گیا ہے۔ اور چونکہ وہ میری حفاظت میں آیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ مَیں ہی اس جُرم کا مجرم قرار دیا جاؤں۔ ہر چند مَیں دونوں آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں اور مَیں کہہ سکتا ہوُں کہ اصل قاتل یہ تھے لیکن پھر بھی دُنیا مجھی کو ذمّہ دار قرار دیگی۔ اب مَیں کیا کر سکتا ہوُں اور اپنی عزّت کیونکر قائم رکھ سکتا ہوں۔ ایسی زندگی بیکار ہے اور اب میرے لئے کوئی چارہ سوا اس کے نہیں ہے کہ مَیں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں۔" چنانچہ آہستہ آہستہ یہ ارادہ مستقل عزم میں تبدیل ہو گیا اور اب میں اُٹھا تا کہ تلوار کی نوک پر اپنے آپ کو گرا دوں لیکن میں ابھی اپنے کوٹ کے بٹن کھول ہی رہا تھا کہ سامنے سے کوئی شخص آتا ہوا نظر آیا اور جب مَیں نے دیکھا کہ یہ نپولین ہے تو میری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔

وُہ مجھ سے صرف دس گز کے فاصلہ پر تھا۔ چاندنی اس کے چہرہ پہ پڑ رہی تھی، اور اپنے دونوں ہات پشت پر رکھّے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی مردانہ بھاری آواز میں دریافت کیا "تم اپنی طرف سے کیا جواب پیش کرتے ہو؟"

ایک تو نپولین کا آجانا ہی میرے لئے سخت حیرت ناک واقعہ تھا۔ حتیٰ کہ اگر وُہ ایک لمحہ اور بات نہ کرتا تو یقیناً میں اُسے کوئی بھوت سمجھ کر زمین پر گر پڑتا اور اس پر اُس کا یہ پوچھنا کہ کیا جواب رکھتے ہو؟ میرے بدن کا ایک ایک ریشہ کانپ رہا تھا۔

پھر خود ہی اُس نے کہا کہ "ایک کو تم نے مار ڈالا ہے لیکن دُوسرا شاید بھاگ کر بچ گیا"

مَیں نے عرض کیا کہ "مَیں نے اُسے بھی ختم کر دیا"

وُہ یہ سُن کر چونک پڑا اور بولا۔ "کیا یہ سچ ہے تم نے واقعی اس کو بھی فنا کر دیا"؟ وہ مُسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اس حال میں کہ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

مَیں نے عرض کیا کہ "ایک کی لاش تو اُسی درخت کے نیچے ہے اور دوسرا اُس جھونپڑے میں پڑا ہے"

یہ سُن کر نپولین نے میرے شانہ پر ہات رکھ کر کہا "مَیں خوش ہوں کہ تم نے اپنی شہرت کو قائم رکھا" لیکن مَیں ابھی تک یہ یقین نہ کر سکا تھا کہ یہ واقعی نپولین ہے۔ اس نے میری حالت کو دیکھ کر میرے خیالات کو سمجھا اور

بولا کہ میں بھوت نہیں ہوں کیونکہ جس شخص نے میری طرف سے جان دی ہے۔ وہ میرا ایک وفادار غلام تھا۔ جو بہت کچھ میرے ہمشکل تھا۔ نہیں تو کوئی عذر نہیں پہنچا؟"

میں نے عرض کیا کہ "نہیں لیکن اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو......"

نپولین نے قطع کلام کر کے کہا "نہیں۔ نہیں جو کچھ گزرا" میں سب دیکھ رہا تھا۔ جب تم نے تعاقب کیا تو میری نگاہیں تمہارے ساتھ تھیں اچھا اب میرے ساتھ اس مقام تک چلو"۔

جب ہم وہاں پہنچے تو دونوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور رستم و مصطفٰے دو غلام وہاں کھڑے ہوئے تھے اس وقت میرے فخر و انبساط کا یہ عالم تھا کہ میری ہر ہر ادا سے اس کی نمائش ہو رہی تھی۔ نپولین نے بھی اسے محسوس کیا اور بولا کہ کیا تم اپنے اسی انداز سے دنیا کو یہ یقین دلاؤ گے کہ کوئی اہم واقعہ نہیں گزرا۔ یہ ادا ترک کرو۔ ورنہ میں تمہیں ایسی پلٹن میں تبدیل کر دوں گا جہاں تمہاری کوئی بات بھی نہ پوچھے گا"۔

یہ نپولین کی فطرت تھی کہ جب وہ کسی کے احسان کا زیر بار ہوتا تھا تو اپنے انداز سے اس احسان کی اہمیت کو ضعیف کر کے احسان کرنے والے کے

حقوق کو بہت کچھ ہلکا کر دیا تھا۔

جس وقت نپولین اپنے قصر میں واپس آیا بارہ بج چکے تھے اور میں اس کو پہنچا کر واپس جانا چاہتا تھا لیکن اُس نے اشارہ سے مجھے اندر ہی بُلا لیا اور خود ایک آرام کرسی پر جا کر اس طرح خاموش لیٹ گیا۔ گویا وہاں میرا وجود ہی نہ تھا جب بہت دیر ہو گئی تو میں آہستہ سے کھانسا تاکہ وُہ میری طرف متوجہ ہو۔ اور یہ تدبیر کارگر ہوئی کیونکہ میرے کھانسنے کی آواز سُن کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "ہاں تو تم حقیقت معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب ہو گئے ہو"؟

میں نے عرض کیا کہ "مجھے تو کوئی جستجو نہیں ہے"۔

نپولین نے کہا۔ یہ صرف لفظ ہی لفظ ہیں کیونکہ دروازہ سے باہر نکلنے کے بعد ہی تمہیں جستجو پیدا ہو جائیگی۔ دو دن میں تمہارے ساتھ کے افسر اس واقعہ کو جان لیں گے اور چوتھے دن سارے پیرس میں یہ خبر گشت لگاتی ہو گی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر میں تمہاری جستجو کو حقیقت کا اظہار کر کے مطمئن کر دوں تو پھر تم باہر کہیں اس کا ذکر نہ کرو گے، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کارسیکا کے رہنے والے تھے اور کسی زمانہ میں ایک ہی سوسائٹی کے ہم لوگ ممبر تھے۔ اس

سوسائٹی کے قواعد نہایت سخت تھے اور میں ان کا نہایت پابند تھا۔ لیکن بعد کو واقعات نے مجبور کیا کہ مَیں ان قواعد کے خلاف عمل کروں۔ اس لئے یہ دونوں کارسکا سے یہاں آئے تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ مَیں اِس ملنے کا مُدعا جانتا تھا اور یقین تھا کہ ان سے ملنا جان ضائع کرنا ہے۔ اگر مَیں ان کی طلبی کی پروا نہ کر کے وہاں نہ جاتا تو بھی میری جان خطرہ میں تھی۔ کیونکہ میں اس سوسائٹی کے طریقوں سے بخوبی واقف ہوں۔ ممکن تھا کہ مَیں ایک پُوری فوج سے کام لے کر ان کو زندہ گرفتار کرا لیتا۔ لیکن اس صورت میں اُن کی زبان کو کون روک سکتا۔ اگر دو آدمی سے زیادہ وہاں جاتے تو وُہ ظاہر نہ ہوتے۔ اس لئے مَیں نے بہت سوچ کر یہ تدبیر اختیار کی اور وُہ میرے ایک غلام کو جو میرے بہت ہم شکل تھا نپولین سمجھ کر حملہ آور ہوئے اور پھر سارا حال تم کو معلوم ہے۔ مَیں خوش ہُوا کہ تم نے توقع کے مطابق خدمت انجام دی اور آئندہ اس کا خیال رکھو گے کہ کبھی تمہارے مُنہ سے کوئی لفظ اس کے متعلق نہ نکلے۔"

مَیں نے عرض کیا کہ مَیں اپنے دماغ سے ان تمام واقعات کو اسی وقت محو کئے دیتا ہوں اور یہاں سے ویسا ہی واپس جاؤنگا جیسا کہ یہاں آیا تھا۔"

نپولین نے جواب دیا کہ "ایسا تو نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تم یہاں آئے تھے تو معمولی لفٹننٹ تھے اور واپس جا رہے ہو تم ایک کپتان کی حیثیت سے"۔

(کانن ڈائل) (نگار مارچ ۱۹۲۵ء)

# ایک عجیب و غریب تاریخی جرم

(۱)

اڈمونڈ کی عمر ۲۴ سال کی تھی جب اس نے ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ چونکہ یہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے انہیں اس کی کامیابی پر بڑی مسرت ہوئی اور اس کے باپ نے جو ولیفؔ میں ڈاکٹر تھا اپنے بیٹے کیلئے پیرس کے قیام کو مناسب سمجھا۔

چونکہ اڈمونڈ حسن سیرت کے لحاظ سے بھی اپنے اندر خاص کشش رکھتا تھا۔ اس لئے وہ یہاں بہت جلد مشہور ہوگیا اور پیرس کے اعلےٰ اعلےٰ خاندانوں میں اس کی رسائی ہوگئی۔

اس کو پیرس میں اپنا کام شروع کئے ہوئے ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ اس کا ایک دوست جو زمانۂ طالب علمی کا رفیق تھا۔ ایک دن اڈمونڈ کے پاس آیا اور بولا کہ مَیں آج کی رات ایک نہایت اہم ضرورت سے پیرس چھوڑ رہا ہوں مَیں بڑا ممنون ہونگا اگر آپ میری غیبت میں میرے ایک مریض کا علاج جاری رکھیں۔ چونکہ وُہ بہت غریب ہے۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ میرے بعد مشکل سے وُہ کوئی طبّی مشورہ حاصل کرسکتا ہے۔ اس کا نام لوئیس باور ہے اور اپنی بیوی کی اعانت سے تصویریں بنا کر بہ مشکل بقدر کفاف حاصل کرسکتا ہے۔

اڈمونڈ نے پُورے جوشِ مسرّت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کرلیا اور اسی وقت وُہ باور مصوّر کے مکان پر پہنچا۔ لیکن بدقسمتی سے وُہ حالتِ نزع میں تھا اور قبل اس کے اڈمونڈ اس کے لئے کوئی دوا تجویز کرتا اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی کو قدرتاً بیتاب و ملول ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وُہ دنیا میں اپنے چھوٹے بچّوں کی پرورش کرنے کے لئے تنہا رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے اضطرار کا یہ بھی ایک خاص سبب تھا کہ وُہ غریب مرنے والے کی تجہیز و تکفین بھی نہ کرسکتی تھی۔

اڈمونڈ نے یہ حالات معلوم کر کے اس کو تسکین دی اور اپنے پاس سے تمام ضروری مصارف ادا کر کے آئندہ بھی اعانت کا وعدہ کیا۔ چونکہ اس قسم کی ہمدردی دوستی و محبّت کے تمام مدارج وفعتاً طے کرا دیتی ہے۔ اس لئے ان دونوں میں فوراً خلوص پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ اڈمونڈ کو اس سے محبّت ہو گئی، کیونکہ سرآدین (باورصنوّر کی بیوی) حقیقتاً صُورت کے لحاظ سے بڑی دلکش چیز تھی۔ اور ایک انسان کے لئے مشکل تھا کہ اس کے دائرہ جذب و کشش سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

اڈمونڈ کی اس حیاتِ معاشقہ کو تین سال کا زمانہ گزر گیا اور اس مدّت میں مخفی محبّت کی جتنی لذّتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان دونوں نے حاصل کیں۔ آخر کار ایک دن آیا کہ سرآدین کی نگاہ سے پردہ اٹھا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اڈمونڈ اس سے بیزار ہو گیا ہے اور اس کی اعانت و محبّت سے وُہ بالکل محروم ہو گئی ہے۔

اِس نشہ کے زائل ہونے کے بعد اڈمونڈ نے پھر اپنے پیشہ کی طرف توجہ کی اور پُورے انہماک کے ساتھ کسب جاہ و شہرت میں مصروف ہو گیا، چونکہ اڈمونڈ میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طبیب یا ڈاکٹر

کو بامِ شہرت پر پہنچا دیتی ہیں۔ اس لیئے وُہ اپنے مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو گیا اور اس کے والدین کو اس کی شادی کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔

ایک دن یہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک نہایت ہی حسین نوجوان لڑکی کو گاڑی میں سامنے سے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بھی اپنا سمتِ سفر بدل کر اسی کے پیچھے پیچھے جانا شروع کیا حتیٰ کہ وُہ ایک جگہ اُتر کر مکان میں داخل ہو گئی۔ اب اس کے لیئے یہ معلوم کرنا چنداں دشوار نہ تھا کہ یہ کس خاندان کی لڑکی تھی، اور اس کے کیا حالات ہیں۔ اس لیئے اس نے یہ تمام باتیں معلوم کر کے اپنی ماں کو اطلاع دی اور آخر کار ڈھونڈ کی آمد و رفت وہاں شروع ہو گئی۔ چونکہ یہ سارے پیرس میں خاص شہرت رکھتا تھا اور علاوہ حسنِ ظاہری کے اس کی دولتمندی بھی بڑی سفارش تھی۔ اس لیئے وُہ لڑکی اس کی طرف بہت جلد مائل ہو گئی۔ چونکہ پیرس میں لڑکی کے والدین اوّل اوّل اظہارِ رضامندی سے انکار کر دیتے ہیں تاکہ اس طرح دونوں میں اور زیادہ محبّت بڑھ جائے اس لیئے لڑکی کی ماں نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن جب لڑکی اس صدمہ سے سخت بیمار ہو گئی

اور چارۂ کار دوسرا نظر نہ آیا تو اس کی شادی اڈمونڈ سے کردی گئی۔

بظاہر اڈمونڈ کو ہر شخص دولتمند انسان سمجھتا تھا اور اس کے پیشہ کی کامیابی کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی مالی حالت بہت خراب تھی اور قمار بازی کی عادت نے جو بلاد مغرب کی تمام بلند سوسائٹیوں میں بکثرت رائج ہے۔اُسے سخت تباہ کر رکھا تھا۔لیکن بظاہر وُہ اپنی کمزوری کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا اور ہر شخص اُسے کامیاب وبامراد خیال کرتا تھا۔

شادی کے دوسرے سال اس کی لڑکی پیدا ہوئی اور اسی زمانہ میں جب کہ تہنیت پیش کرنے والے احباب آتے جاتے رہتے تھے۔اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "تم اپنی لڑکی کی زندگی کا بیمہ کیوں نہیں کراتے سالانہ تھوڑی سی رقم ادا کرنی پڑیگی اور بارہ سال کے بعد یکمشت تم کو معتد بہ رقم مل جائیگی جس کو تم اس کی تعلیم پر صرف کر سکتے ہو۔"

اڈمونڈ نے اس رائے کو پسند کر کے اسی وقت بیمہ کمپنی کے ایک کارکن کو بلا کر تمام مراحل طے کر لیئے تھے اور پھر بدستور اپنی بظاہر خوشحال اور بباطن تباہ زندگی کے مصائب میں گرفتار ہو گیا۔نہیں کہا جا سکتا۔کہ اس

کے یہ آلام و مصائب کس حد تک پہنچ جاتے اگر اسی اثنا میں اس کی ساس جو اپنی بیٹی سے ملنے آئی تھی دفعتہً بیمار ہو کر نہ مر جاتی۔ چونکہ یہ مالدار عورت تھی اس لئے اس کا تمام ترکہ اس کی بیٹی کو ملا اور اس طرح کچھ دنوں کیلئے اڈمونڈ کی فکروں میں بہت کچھ کمی پیدا ہو گئی۔

(۲)

پیرس کے اس حصہ میں جو غربا کے رہنے کے لئے مخصوص ہے ایک حقیر و بوسیدہ مکان میں سرادین اپنی پریشان زندگی بسر کر رہی ہے۔ اب اس کا سن ۵۰ سے متجاوز ہو چکا ہے اور تصویر کشی کے ذریعہ سے صرف اس قدر حاصل کر سکتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حیات باقی رہے۔ اس لئے وُہ اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کر سکتی۔

اسی حال میں کئی سال بسر ہو گئے اور اڈمونڈ کے حال سے۔ جس کی محبت میں اُس نے اپنی پوری زندگی کے تین سال حد درجہ لطف و مسرت کے ساتھ بسر کئے تھے۔ وُہ بالکل بے خبر رہی۔ اس میں شک نہیں کہ سرادین کو اب بھی اس سے محبت تھی اور وُہ اب بھی اس کی بے اعتنائیاں اور بے پروائیاں معاف کر دینے کے لئے تیار تھی۔ لیکن اڈمونڈ نے جو ایک بار

اس کی طرف سے مُنہ موڑا تو پھر خبر نہ لی کہ وُہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

ایک دن جب کہ وُہ حد درجہ مایوس بُجھی ہوئی آگ کے پاس بیٹھی ہوئی اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش میں معروف تھی۔ دفعتہً کسی شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، سرادین اُٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اڈمونڈ کو اپنے سامنے دیکھا۔ بجلی کی طرح تمام گزشتہ واقعات اس کے دماغ سے گزر گئے اور اس نے محسوس کیا کہ وُہ اب بھی اسی شدّت کے ساتھ اڈمونڈ سے محبّت کرتی ہے۔ اڈمونڈ نے اس کے دونوں ہات اپنے ہات میں لے لئے اور بولا کہ :۔

اے سرادین اب گزشتہ دَورِ محبّت کی یاد مجھے نہ دلاؤ کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے۔ البتہ مَیں اس پر بہت نادم ہوں کہ اتنے عرصہ تک مَیں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ بہرحال اب مَیں اس غفلت کی تلافی کے لئے آمادہ ہوں۔"

سرادین نے جواب دیا کہ مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے اپنے بچّوں کی تعلیم کی بڑی فکر ہے۔

جس کا انتظام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے بڑی لڑکی کی طویل علالت نے بھی مجھے سخت بے چین کر رکھا ہے۔"

اڈمونڈ "کہاں ہے۔ بلاؤ۔"

سراوین اُٹھی اور اپنے ایک پڑوسی کے مکان سے اُسے بلا لائی۔

اڈمونڈ نے نہایت غور سے اُسے دیکھ کر کہا "اس کی حالت اچھی ہے اور صرف غذا میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہے، سو تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں سارا انتظام کردونگا۔ اور ہاں تمہاری بہن میڈم ریٹر کا کیا حال ہے، کیا تم سے ملاقات نہیں ہوتی؟"

سراوین "نہیں کبھی کبھی آتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا حال مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ اس لئے وہ میری مدد کیا کرسکتی ہے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں طرف سکوت طاری رہا اور پھر اڈمونڈ نے اپنی کرسی قریب کرکے کہا۔ "اے سراوین! ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے جس سے نہ صرف تمہارا بلکہ تمہاری اولاد کا مستقبل بھی امید افزا ہو جائیگا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں وہ تدبیر بیان کروں۔ مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروگی ورنہ میرے تمہارے دونوں کے لئے مشکلات پیش

آجائیں گی"۔

سرادین۔"کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمہارے کسی راز کو ظاہر کر دیا ہو؟"

اڈمونڈ۔"اس کا مجھے یقین ہے۔ لیکن احتیاطاً میں پھر کہتا ہوں کہ یہ تدبیر کسی انسان پر ظاہر نہ ہونی چاہیئے"۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور باہر دروازہ سے نکل کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد اندر سے بند کر لیا اور سرادین کے قریب آ کر بولا کہ سب سے پہلے تو ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ تمہاری زندگی کا بیمہ کرا دیا جائے چونکہ تمہاری عمر چالیس سال سے زائد نہیں ہے اور صحت بھی اچھی ہے اس لئے کمپنی بڑی رقم کا بیمہ کرنے پر تیار ہو جائیگی"۔

سرادین حیرت زدہ ہو کر بولی کہ "میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ سالانہ قسط کیونکر ادا کر سکونگی اور اگر یہ میرے امکان میں ہوتا تو میں پانچ ہزار فرانک کا بیمہ کرانے کے لئے تیار ہو جاتی"۔

اڈمونڈ "پانچ ہزار! میں تو پانچ لاکھ فرانک کا بیمہ کرانا چاہتا ہوں۔ چونکہ میری حالت فی الحال اچھی ہے۔ اس لئے دو چار قسطیں ادا

کردونگا۔ اور اس کے بعد ادا کرنے کی نوبت ہی نہ آئیگی"۔

سرادین یہ سُن کر ایک حیرت ناک تبسم کے ساتھ مُسکرائی۔ اڈمونڈ نے کہا "میرا اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ تم جلد مرجاؤ گی اور اس لیے قسطوں کے ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ تم ماشاء اللہ ابھی صحیح و توانا ہو اور مجھے یقین ہے تم اپنی عمر طبعی کو پہنچو گی"۔

یہ سُن کر سرادین اور زیادہ "متحیر" ہوئی کہ پھر قسطوں کے ادا کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور اس لیے وہ اب سراپا استفہام تھی۔ اڈمونڈ نے کہا کہ اُس کی تدبیر یہ ہے کہ ایک یا دو قسطوں کے بعد تم اپنے تئیں کسی سخت مرض میں مُبتلا ہونا ظاہر کرو گی اور حسب قاعدہ تمہیں بیمہ کمپنی کو اس کی اطلاع کرنی ضروری ہوگی۔ جب کمپنی دیکھیگی کہ تمہاری جان خطرہ میں ہے تو فوراً مفاہمت کی کوشش کریگی اور تمہاری زندگی بھر چار یا پانچ ہزار فرانک سالانہ پر یہ معاملہ طے ہو جائیگا۔ یہ میرا ذمّہ ہے کہ بظاہر تم سخت مرض میں مبتلا نظر آتی رہو اور دراصل تمہیں کوئی آزار نہ ہو"۔

اس میں شک نہیں کہ اگر سرادین طبعاً شریف النفس ہوتی تو اس مکر و فریب کو کبھی گوارا نہ کرتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افلاس اچھے سے

اچھے اخلاق کے انسان میں ردّی خصائل پیدا کر دیتا ہے اور آخرکار سراوین نے بھی اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔

(۳)

چند دن میں بیمہ کی کارروائی مکمل ہو گئی اور ڈاکٹر اڈمونڈ نے اپنی ضمانت پیش کر دی کہ ۸۰۰ گنی کی سالانہ قسط ادا ہوتی رہیگی۔ اس کے بعد اڈمونڈ نے وہ تدابیر شروع کیں جن سے صرف وہی واقف تھا۔ چنانچہ وُہ ایک مشہور وکیل کے پاس گیا اور بیان کیا کہ "جس زمانہ میں سراوین سے میرے تعلقات تھے اس وقت مَیں اس کو وقتاً فوقتاً قرض دیتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ قرض کے مقدار بہت بڑھ گئے اور اب اس کے ادا ہونے کی صورت یہی تھی کہ اس کی زندگی کا بیمہ کرا کے اس رقم کو قابلِ وصول بنالے۔ چنانچہ سراوین اس پر راضی ہو گئی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔ ورنہ میری بیوی کو سخت ناگوار ہوگا۔"

وکیل نے پوچھا کہ "قرض کی مقدار کتنی ہے"۔

اڈمونڈ نے بجائے ۵ لاکھ فرانک کے صرف ایک لاکھ فرانک بتایا۔ ہر چند وکیل کو اس پر بھی سخت حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے ایک دستاویز کا

مسوّدہ مرتّب کر دیا اور ڈاکٹر نے اپنے گھر جا کر اُسے صاف کر کے وہی پانچ لاکھ فرانک کی رقم درج کی اور سراوین سے اس پر دستخط لے لئے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک وصیّت نامہ بھی اس سے لکھوا لیا کہ میرے بعد میرے تمام مطالبات جو بیمہ کمپنی پر عائد ہونگے ان کا مالک ڈاکٹر اڈمونڈ ہو گا۔ اور وہی میری اولاد کا والی ہو گا۔"

(۴)

چار مہینے گزر گئے اور سراوین لُطف و مسرّت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی۔ کیونکہ اڈمونڈ اس کے مصارف کے لئے بھی ہر ماہ معقول رقم دیا کرتا تھا۔ ایک دن اڈمونڈ آیا اور بولا کہ "آج میری بیوی ریلینا چلی گئی۔ اس لئے مجھے فرصت مل گئی کہ تم سے قرارداد کے متعلق مریض بننے کی درخواست کروں"۔

سراوین "لیکن میں حیرت میں ہوں کہ کس بیماری کا بہانہ کروں جب کہ میں آج معمول سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں"۔

اڈمونڈ "میری رائے میں تمہیں ظاہر کرنا چاہئے کہ تم زینہ سے گر پڑی ہو اور تمہیں کوئی سخت عصبی صدمہ پہنچا ہے"۔

آخر کار رات کو تمام پڑوسیوں نے زینہ پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سُنی اور صبح کو سب نے جان لیا کہ سرادین پھسل گئی اور اس کے سخت چوٹ آئی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر بلایا گیا اور اس نے علاج شروع کیا۔ جب سرادین کی بہن کو خبر معلوم ہوئی تو وُہ بھی عیادت کے لئے آئی۔ اور اُس سے سرادین نے سارا حال بیان کر کے عہد لے لیا کہ کسی پر ظاہر نہ کرے گی۔

(۵)

جب ایک مہینہ سرادین کی بیماری کو ہو گیا تو اڈمونڈ آیا اور بولا۔ کہ اب وقت آیا ہے کہ بیمہ کمپنی کو اطلاع دی جائے لیکن خرابی یہ ہے کہ جب کمپنی اپنا ڈاکٹر معائنہ کے لئے بھیجے گی اور تمہیں صحیح و توانا پائیگی تو نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ اس لئے مَیں تمہیں ایسی دوا دیتا ہوں جس سے تم عارضی طور پر بیمار پڑ جاؤ گی، ۲۴ گھنٹے کے بعد پھر اچھی ہو جاؤ گی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ تمہیں اسطرح تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑیگی"۔

سرادین اس پر راضی ہو گئی اور دوا پینے کے بعد بیمہ کمپنی کو اپنی علالت کی اطلاع دی۔ دوا نے اپنا اثر کرنا شروع کیا اور وُہ انتظار کرنے

گی کہ کمپنی کا کوئی ڈاکٹر آتا ہوگا۔ لیکن وہ اس سے واقف نہ تھی کہ کمپنی کبھی اپنا ڈاکٹر نہیں بھیجتی کہ مبادا وہ شخص جس کی زندگی کا بیمہ کیا گیا ہے بُرا مانے اور غصہ میں قصداً اپنی جان دے دے۔ اس لئے وُہ انتظار ہی کرتی رہی اور اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اس درمیان میں اڈمونڈ کی ایک تحریر پہنچی کہ "مَیں آرہا ہُوں اور شام تمہارے ہی پاس بسر کرونگا"۔ اس تحریر کو پڑھ کر سرادین بہت مسرور ہوئی اور اپنی تکلیفوں کو زیادہ صبر و ضبط سے برداشت کرنے لگی۔

آخر کار شام کو ۶ بجے اڈمونڈ آیا اور رات کے دس بجے تک وہیں رہا۔ لیکن سرادین کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ صبح کو پڑوسیوں نے اسی ڈاکٹر کو پھر بلایا جس کا علاج پہلے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن جب وُہ آیا تو اس سے کسی نے کہہ دیا کہ "مریضہ نے تمہاری دوائی نہیں پی"۔ اس لئے وہ برہم ہوکر چلا گیا۔

شام کو پھر اڈمونڈ گھبرایا ہوا آیا، اور دوا کی دوسری خوراک دے کر بولا کہ "مَیں ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے ایک خاص ضرورت سے ریلیف جانا ہے" اس خوراک کے بعد سرادین کی حالت بہت ردّی ہوگئی اور مجبوراً اگیا اور

ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا۔ اس نے ہیضہ تجویز کیا اور دوا پینے کے لئے دی۔

سرادین مسکرائی اور اپنی بڑی لڑکی سے بولی کہ اس ڈاکٹر کی دوا مجھے اچھا نہیں کر سکتی"۔ تم ناحق فکر کرتی ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔ جب دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر دوبارہ آیا تو سرادین حالتِ نزع میں تھی اور اس کے سامنے اس نے جان دے دی۔

شام کو اڈمونڈ نے کمپنی کو اطلاع دی کہ "سرادین کا انتقال ہو گیا ہے اور وصیت کے ذریعہ سے اپنے تمام مطالبات کا مالک مجھے بنا گئی ہے"۔ کمپنی نے اڈمونڈ کے دعوے اور سرادین کے وصیت نامہ کو صحیح تسلیم کر لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ روپیہ ادا کرتی۔ پولیس کے پاس ایک گمنام تحریر اس مضمون کی پہنچی کہ "سرادین کی موت ایک راز ہے اور پولیس کو اس کی تفتیش کرنی چاہیے"۔

جب چودہ دن گزر گئے اور بیس ہزار گنی کی رقم جو اڈمونڈ کو ملنی چاہیے تھی نہیں ملی تو یہ سخت برہم ہوا اور کمپنی سے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ لیکن دوسرے دن صبح کو جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ دروازہ کی گھنٹی بجی اور خادمہ ایک کارڈ لے کر آئی۔ اڈمونڈ نے

اس کارڈ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وُہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہے۔ چنانچہ اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے کہ میں ابھی پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں" ۔ باہر گیا اور بغیر کسی خوف و ہراس کے اظہار کے اس سے گفتگو شروع کی۔

خفیہ پولیس کے افسر نے کہا کہ "ہمارے محکمہ کو اطلاع ملی ہے کہ سرادین کی موت ایک راز ہے اس لئے اس کی لاش قبر سے برآمد کی گئی اور معائنہ سے معلوم ہوا کہ ایک نباتی زہر کے ذریعہ سے جسے ڈجی ٹلیس کہتے ہیں۔ اس کی موت وقوع میں آئی ہے۔ چنانچہ اس کے کاغذات وغیرہ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا بیمہ بڑی رقم پر کرایا تھا۔ کمپنی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وُہ ساری رقم آپ کو ادا کی جاتی ہے۔ اس لئے میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ سرادین ایسی مفلس عورت کیونکر اتنی بڑی رقم پر اپنی زندگی کا بیمہ کرا سکی۔ جب کہ وُہ کسی طرح ایک قسط بھی ادا نہ کر سکتی تھی"۔

اڈمونڈ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ تمام باتوں کا جواب دیا اور سرادین کی تحریریں نکال کر اس پر ثابت کر دیا کہ وُہ اس کی مقروض تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میرا قرض تو اس کے اُوپر صرف بیس ہزار

فرانک ہے۔ جو مجھ کو ملے گا باقی اس کی وصیت کے مطابق اس کی اولاد کی تعلیم پر صرف ہو گا۔

پولیس افسر رخصت ہو گیا۔ لیکن جب وُہ پھر اپنی بیوی کے پاس گیا اور وہاں کھڑکیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ خفیہ پولیس اس کے مکان کی نگرانی کر رہی ہے اور وُہ حراست میں ہے اب چونکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اور اُسے آنے میں دیر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے مجبوراً اپنی بیوی سے سارا حال ظاہر کرنا پڑا۔ مگر وُہ خاص باتیں جو اُسے مجرم بنانے والی تھیں۔ نہ اپنی بیوی پر ظاہر کیں اور نہ پولیس افسر کو ان سے آگاہ کیا۔

(٦)

دوسرے دن اڈمونڈ باضابطہ حراست میں لے لیا گیا اور سارے پیرس میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اڈمونڈ کا خسر چونکہ پیرس کا نہایت مشہور وکیل تھا اور اڈمونڈ خود بھی اپنے ظاہری اخلاق کی بدولت کافی مقبول تھا۔ اس لئے جب مقدمہ عدالت گاہ میں پیش ہوا تو ہر شخص اڈمونڈ کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے آمادہ تھا اور پیرس کے بہترین وکلا اس

کے ساتھ تھے۔ سرکاری وکیل نے جو ثبوت پیش کیا۔ اس میں سب سے اہم سرادین کی بہن کا بیان تھا جس کو سارا حال معلوم تھا اور اس کے ڈاکٹر کی شہادت تھی جس کو سرادین کی لاش میں ڈجی ٹیلیس کے ذرّات دستیاب ہوئے تھے۔

جس وقت سرکاری وکیل نے اڈمونڈ کے خلاف اپنی گفتگو شروع کی تو اُس نے دورانِ بحث میں یہ بھی ظاہر کیا کہ اڈمونڈ کی ساس بھی غالباً اس جذبہ کا شکار ہوئی۔ لیکن چونکہ وُہ اس کو ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔ اور صرف سرادین کے واقعاتِ قتل پر پوری روشنی ڈال کر اڈمونڈ کو قاتل ثابت کیا۔

اڈمونڈ کے خسر نے صفائی میں اڈمونڈ کی گزشتہ زندگی اور اس کی پاکیزہ اخلاق کی متعدد مثالیں پیش کر کے اپنی قوتِ بیان سے جج کے خیال کو بالکل اپنے موافق کر لیا۔ لیکن فیصلہ کے وقت جوری سے رائے لی گئی تو اُنہوں نے اُسے سرادین کے قتل کا مرتکب قرار دیا۔ اور سزائے موت اس کے لئے تجویز کی گئی۔ لیکن اڈمونڈ کی عجیب وغریب فطرت اپنی تکمیل کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوئی۔ جب قصاص کے وقت

اُس نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

"آپ لوگ شاہد رہیں اور میرے تمام اعزّہ و احباب کو یہ خبر پہنچا دیں کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور عدالت کی غلطی پر میری قربانی چڑھائی جاتی ہے۔"

(ماخوذ) (نگار مئی ۱۹۲۴ء)

# ایک فلسفی کا انجام

ایک دن ممنون کے دل میں آیا کہ مجھ کو فلسفی ہونا چاہیئے اور فلسفی بھی ایسا کہ ساری دنیا میں میری شہرت ہو اور ہر شخص میری عزّت کرے"۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ مقصود حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ نفس کو بُرائیوں سے بچاؤں اور ایسے مشاغل سے احتراز کروں جو خواہشات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ بیشک یہ بہت دشوار امر ہے لیکن اس کی اوّلین تدبیر یہ ہے کہ محبّت سے دُور رہوں۔ اگر کوئی جمیل عورت نظر بھی آئے تو مجھے اپنے دل کو یوں سمجھانا چاہیئے کہ اس کے رخساروں کی تازگی و رونق فانی چیز ہے اور چند دن میں زائل ہو جائیگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کا جادو

اور اس کے نگاہوں کی تڑپ عارضی ہے اور شباب زائل ہو جانے کے
بعد ان میں سے کوئی کیفیت باقی نہ رہے گی۔ اس طرح اس کا بلوّریں
سینہ بھی ڈھل کر ایک نہ ایک دن بے معنی چیز ہو جائیگا۔ بال سفید ہو
جائیں گے اور تیر سا قد جھک کر کمان ہو جائیگا۔ دوسری احتیاط یہ ہونی چاہیے
کہ مسکر چیزوں سے پرہیز کروں۔ کیونکہ فقدانِ عقل، نقصانِ صحت اور
تضیع اوقات کا بڑا سبب انہیں مسکر اشیاء کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ اسی
کے ساتھ کھانے کے مسئلہ میں بھی یہ التزام ہونا چاہیے کہ صرف اسی قدر
کھایا جائے جتنی ضرورت ہے۔ کیونکہ زندگی کے لیے ہے نہ کہ زندگی کھانے
کے لیے۔ اس کے علاوہ چونکہ میری ضروریات کم ہیں اور دولت کافی ہے
جو شاہی خزینہ دار کے پاس جمع ہے۔ اس لئے میں استغناء کے ساتھ اپنی
پوری زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ نہ مجھے کسی حاکم کے پاس جانے کی ضرورت
ہوگی نہ میں کسی پر حسد کروں گا۔ نہ مجھ پر کوئی حسد کرے گا۔ خوش قسمتی سے
بعض اچھے دوست بھی مجھے مل گئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ رشتہ
الفت قائم رہے۔ جب میں اُن کے افعال و حرکات پر کوئی تنقید ہی نہ کروں گا
تو پھر کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوگا۔"

جب ممنون اپنی اس کارگاہِ خیال سے فارغ ہوا اور تمام تدبیریں منضبط ہو گئیں تو اُس نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور دریچہ کے پاس کُرسی ڈال کر نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا گویا اس نے ان تدبیروں پر عمل شروع کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دریچہ سے دیکھا کہ دو عورتیں اس کے گھر کے سامنے سڑک پر جا رہی ہیں جن میں سے ایک بہت ضعیف ہے۔ لیکن اس کے چہرہ سے اطمینان ٹپک رہا ہے۔ دوسری بہت کمسن و جمیل ہے مگر اس کے بشرہ سے علامات قلق و اضطراب پیدا ہیں اور برابر رو رہی ہے اور جس قدر روتی جاتی ہے اس کا حُسن و جمال زیادہ دلکش ہوتا جاتا ہے۔

اس منظر کا ہمارے فیلسوف کے قلب پر بہت اثر ہوا لیکن یہ اثر اس کے حُسن کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس کا تو وہ عہد ہی کر چکا تھا۔ صرف ہمدردی اس کا سبب تھا۔ یہ جلدی جلدی نیچے اُتر کے گیا اور اس سے گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا۔ لڑکی نے اپنے لب و لہجہ میں ہر ممکن تاثیر پیدا کرتے ہوئے اپنی داستانِ درد سُنائی اور بولی کہ میرے چچا نے

میرا سارا سامان چھین لیا ہے اور میری ساری میراث سے مجھے محروم کردیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مجھے سخت جسمانی عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ میں جان سے بیزار ہوگئی ہوں اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آتا کہ خودکشی کرلوں، آپ بہت ذی فہم انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو زحمت کرکے گھر تک چلیے اور میرا سارا قصّہ تفصیل سے سنیئے۔ ممکن ہے آپ میری مدد کرسکیں۔"

ممنون اس پر راضی ہوگیا اور کوئی وجہ راضی نہ ہونے کی نہ تھی جب یہ گھر پہنچے تو ممنون کو ایک نہایت آراستہ کمرے میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر انتہائی حسنِ تاثر کے ساتھ اپنا حال بیان کرنا شروع کیا۔ وہ روتی جاتی تھی اور حال بیان کر رہی تھی۔ حال بیان کرتی جاتی تھی اور اپنا سحرِ گفتگو بھی پوری طرح صرف کر رہی تھی۔ ممنون نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی دلکش اداؤں کا مطالعہ کر رہا تھا اور نا معلوم طور پر دونوں میں فصل مکانی کم ہوتا جاتا تھا۔ ٹھیک یہی وقت تھا کہ دفعتہً دروازہ کھول کر لڑکی کا چچا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرہ سے انتہائی غیظ وغضب ٹپک رہا تھا۔ لڑکی تو یہ دیکھ کر بھاگ گئی۔ اور ممنون مبہوت و متحیّر اس کی صورت دیکھنے

لگا۔ یہ موقعہ ایسا نہ تھا کہ ممنون اپنے فلسفہ کی مدد سے نجات حاصل کر سکتا اس لئے مجبوراً اس کو اپنی جان و آبرو بچانے کے لئے جو کچھ اُس کے پاس موجود تھا۔ لڑکی کے چچا کے حوالہ کر دینا پڑا۔

ممنون نہایت محجوب و شرمندہ حالت میں گھر واپس آکر پڑا ہوا تھا۔ کہ اس کے بعض احباب کی طرف سے دعوتِ طعام کا رقعہ آیا۔ اُس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر میں گھر میں تنہا رہوں گا تو افکار کا اور زیادہ ہجوم ہوگا۔ کھانے کی بھی خواہش نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت پر خراب اثر پڑیگا۔ اس لئے چلنا ہی مناسب ہے۔ ممکن ہے اُن کی باتوں میں جی بہل جائے۔" چنانچہ وُہ یہ سوچ کر دعوت میں شریک ہوا اور وہاں احباب نے اس کے چہرہ پر آثارِ ملال دیکھ کر شراب پینے پر اصرار کیا۔ ممنون نے دل میں سوچا کہ "تھوڑی سی شراب جس سے یہ ملال دُور ہو جائے چنداں مضر نہیں ہو سکتی بلکہ مفید ہوگی۔" اس لئے اُس نے اوّل اوّل چند جرعے پیئے اور پھر آہستہ آہستہ جب احساس کُند ہونے لگا تو اور زیادہ پینے کی خواہش ہوئی۔ یہاں تک کہ پورا نشہ اس پر مستولی ہو گیا۔ عشا کے بعد جب دوستوں نے جُوا کھیلنے کی ترغیب دی تو اس نے پھر یہ سوچ کر کہ "احباب کے

ساتھ اس قسم کے مشاغلِ تفریحی بُرے نہیں ہوتے۔" جوا بھی کھیلا۔ اور اس حد تک کہ جو کچھ اُس کے پاس تھا وہ ہارا اور اس سے چہار چند کا قرض ہو گیا۔ اس کے بعد کسی بات میں نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں ایک شخص نے ایسی سخت ضرب اس کے چہرہ پر لگائی کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی —— اب یہ گھر واپس آیا لیکن اس حال میں کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ ندارد ہو چکا تھا اس کا چوگنا قرض ہو گیا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے اپنا خادم شاہی خزانچی کے پاس بھیجکر کچھ روپیہ طلب کیا۔ تاکہ رات کا قرض ادا کرے۔ لیکن خادم نے واپس آکر مطلع کیا کہ اس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور ایک پیسہ بھی ملنے کی اُمید نہیں۔ یہ سُن کر ممنون نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو وہ اٹھا اور آنکھ پر پٹّی باندھ کر قصرِ شاہی کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے فریاد کرے اور شاہی خزانچی کے مکرو فریب کا حال بیان کرے

قصرِ شاہی میں پہنچا تو یہاں بہت سی عورتیں امراء کی نظر آئیں۔ جن میں سے بعض اس کو جانتی تھیں اور انھوں نے پوچھنا شروع کیا۔ کہ "ممنون تمہاری آنکھ کیونکر جاتی رہی"۔ اس سوال سے اُس کا غصّہ اور

بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن مجبوراً خاموش رہا اور کسی نہ کسی طرح قصرِ شاہی کے قریب پہنچکر زمین بوس ہوا اور درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ درخواست لے لے اور مضمون سے اطلاع دے۔ سیکرٹری درخواست پڑھ کر ممنون کو علیحدہ لے گیا اور بولا کہ "تو مجھے کوئی بیوقوف مسخرہ معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ بغیر میری وساطت کے درخواست براہِ راست بادشاہ کے سامنے پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ تُو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس شخص کی شکایت کر رہا ہے کہ وُہ میرا چچازاد بھائی ہے اور میری حمایت اسے حاصل ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اس دعوے کو بھلا دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری دوسری آنکھ سلامت رہے۔

---

ممنون نے عہد کیا تھا کہ وُہ محبّت نہ کریگا۔ مُسکرات سے احتراز کریگا جوُا نہ کھیلے گا جو بنیادِ ہے فساد کی اور امن وراحت کی زندگی بسر کریگا۔ لیکن چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک ایک کرکے اس کے تمام عہد باطل ہوگئے اور وُہ ایک بدترین انسان کی حیثیت سے اپنے مکان کی

طرف واپس آیا۔ جب یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ عدالت کے لوگ اس کے گھر کی چیزوں کو باہر نکال کر نیلام کر رہے ہیں۔ اور ممنون کے احباب جن سے اس نے قماربازی میں قرض لیا تھا وہاں موجود ہیں اور اپنے روپیہ کو اس طرح وصول کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کو اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہیں ایک درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس خوبصورت لڑکی کو اپنے چچا کے ساتھ ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا جب ان دونوں نے ممنون کو اس حال میں دیکھا تو قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ غروب آفتاب کے بعد ممنون گھاس کے فرش پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور نہایت شدید تپ میں مُبتلا ہو کر غافل سا ہو گیا۔ اُس نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا۔ جس کے نور سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور جس کے چھ حسین پر تھے۔ ممنون نے اس سے دریافت کیا۔ "تم کون ہو؟"

"تیرا محافظ فرشتہ۔"

"تو پھر مجھ پر رحم کرو اور میری کھوئی ہوئی آنکھ، صحت، دولت اور عقل واپس لا دو۔"

"تم اپنی دُنیا میں ان حادثات سے دوچار نہیں ہوتے۔"

"اے متبرک رُوح! تیرا قیام کہاں رہتا ہے؟"

"بہت دُور۔ کرۂ آفتاب سے ایک ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر۔ ایک نہایت چھوٹے سے ستارہ میں۔"

"کیسا مبارک ہے تمہارا وطن کہ نہ وہاں مکروفریب میں مبتلا کرنے والی لڑکیاں ہیں۔ نہ جھوٹے دوست جو مال بھی چھین لیں اور آنکھ بھی پھوڑ دیں نہ خائن لوگ ہیں کہ دیوالہ نکال کر دوسروں کا مال ہضم کر جائیں اور نہ ایسے حاکم جو عدل و انصاف طلب کرنے پر بُری طرح نکال دیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ ہم عورت کی محبّت کی طرف سے بھی محفوظ ہیں۔ کیونکہ ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے کوئی اثر نہیں ہے، نہ کھانے پینے کی افراط ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم کھاتے پیتے ہی نہیں۔ نہ ہمیں مفلس ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں سونے چاندی کا وجود نہیں۔ نہ آنکھوں کے جانے کا ڈر ہے کیونکہ ہمارے جسم ہی نہیں ہے اور نہ ظلم و جور کا اندیشہ ہے کیونکہ سب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔"

"لیکن اے محترم فرشتے! آپ اپنا وقت کس طرح بسر کرتے ہونگے۔ جب کہ

آپ عورت کی معاشرت اور کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہیں"۔

"ہمارا وقت اُن لوگوں کی امداد میں بسر ہوتا ہے جو ہماری حفاظت میں دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مَیں تمہاری ہمدردی کے لئے آیا ہوں"۔

"افسوس! آپ کل کیوں نہ آئے کہ یہ مصائب مجھ پر نہ پڑتے"۔

کل مَیں ایک تیرے دوسرے بھائی کی خدمت میں مشغول رہا جو شاہِ ہندوستان کے پاس ملازم تھا اور وُہ تجھ سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا۔ کیونکہ بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوالی ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے زنداں میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال اب مَیں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔ تمہاری آنکھ تو البتہ واپس نہیں مل سکتی۔ لیکن اور تکلیفیں رفتہ رفتہ ضرور زائل ہو جائیں گی۔ اگر تم نے پھر کبھی فلسفی بننے کا قصد نہ کیا"۔

"تو کیا فلسفی بننا اس قدر دشوار ہے؟"

"ہاں یہ ایسا ہی دشوار ہے جیسے حکمت و قوت، قدرت و سعادت میں کمال حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ تمام کُرّے جو فضا میں نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں ہر چیز تدریج کے ساتھ حاصل

ہوتی ہے اور تم بھی اصلیح و افضل تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتے ہو۔"

یہ سُن کر ممنون نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا کہ "ہاں ہوگا۔ لیکن میں تو اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کر سکتا جب تک میری کھوئی ہوئی آنکھ نہ مل جائے۔

(والٹیر) (نگار جون ۱۹۲۸ء)

بڑے دل کا درخت

اور

ایک شادی

# بڑے دن کا درخت

اور

# ایک شادی

کل میں ایک شادی میں شریک ہوا.... مگر نہیں! پہلے میں بڑے دن کے ایک درخت کا قصہ سناؤنگا۔ شادی بہت عمدہ تھی اور مجھے پسند بھی بہت آئی۔ مگر دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے معلوم نہیں شادی کے منظر نے مجھے بڑے دن کے درخت کی کیوں یاد دلادی۔ بہرحال وُہ واقعہ اس طرح ہوا :-

ٹھیک پانچ برس ہوئے۔ سالِ نو کے موقعہ پر ایک صاحب نے

جو تجارتی دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ بڑی پہنچ کے آدمی ہیں بڑے لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ ملاقاتیوں کا دائرہ بھی وسیع ہے اور ملنے کی ترکیبیں بھی خوب جانتے ہیں۔ مجھے بچوں کے ایک ناچ میں مدعو کیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بچوں کا ناچ محض اس کا بہانہ ہے کہ والدین ایک جگہ جمع ہوں اور اپنی دلچسپی کی چیزوں کے متعلق گفتگو کریں۔

مَیں اس مجمع میں اجنبی شخص تھا اور چونکہ مجھے کسی معاملہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے مَیں نے دوسروں سے بے نیاز رہ کر اپنی شام گزاری میری طرح حاضرین میں ایک صاحب اور بھی تھے جو یونہی اس موقع پر آ گئے تھے۔ سب سے پہلے میری توجہ اُسی شخص کی طرف منتقل ہوئی۔ صورت سے وُہ اعلیٰ خاندان کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد لمبا اور چھریرا تھا اور خوش پوشاک تھا اور نہایت سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر اُسے اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ہی وُہ ایک گوشہ میں گیا۔ اُس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اُس کی سیاہ گھنی بھوؤں پر بل آ گئے وہ اس مجمع میں بجز میزبان کے اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ مگر بظاہر وُہ بہت خوش نظر

آنے کی کوشش کر رہا تھا بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص کسی صوبہ کا رہنے والا ہے اور یہاں پایۂ تخت میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آیا ہوا ہے اور ہمارے میزبان کے پاس ایک تعارفی خط لایا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اخلاقاً اسے بھی ناچ میں مدعو کر لیا تھا۔ لیکن لوگ نہ اُس کے ساتھ تاش کھیلتے تھے نہ اُسے سگار پیش کرتے تھے۔ کوئی اس سے گفتگو بھی نہیں کرتا تھا۔ غالباً اُنہوں نے چڑیا کو اُس کے پر ہی دیکھ کر دُور سے پہچان لیا تھا۔ بہر حال جب اس کے ہاتھوں کو کسی اور کام کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو وُہ بیچارہ اس تمام وقت میں اپنی مونچھوں ہی کو تاؤ دیتا رہا۔ اُس کی مونچھیں بیشک اچھی تھیں مگر وُہ انہیں ایسی توجہ سے اینٹھتا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ شاید دُنیا میں پہلے مونچھیں پیدا ہوئیں اور اُس کے بعد آدمی تاکہ وُہ انہیں مروڑتا ہی رہے۔

مہمانوں میں ایک اور شخص تھا جس سے مجھ کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مگر وُہ بالکل دوسرے رنگ کا تھا۔ وُہ ایک معزّز آدمی تھا اور لوگ اُسے کونٹ ج کے نام سے پکارتے تھے۔ پہلی ہی نظر میں ہر شخص معلوم کر سکتا تھا کہ وُہ نہایت معزّز شخص ہے اور اس کے تعلّقات میزبان سے اُسی

طرح گے ہیں جس طرح میزبان کے تعلقات مونچھوں والے حضرت سے میزبان اور اُس کی بیوی دونوں اُس کی چکنی چپڑی باتیں کرتے رہتے ہر وقت اُسی کی طرف متوجہ رہتے۔ اس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ اُس کے پاس دوسروں کو لا لا کر تعارف کراتے مگر خود اُس کو کسی کے پاس نہ لے جاتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جب کوڈرچ نے کہا کہ "میں نے بہت کم ایسی خوشگوار شام گزاری ہے" تو میزبان کی آنکھوں میں (خوشی کے مارے) آنسو جھلکنے لگے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد نہ معلوم کیوں مجھے اس معزز مہمان کے سامنے وحشت سی ہونے لگی۔ چنانچہ بچوں سے جی بہلانے کے بعد جن میں پانچ تو خود میزبان کے تھے، میں ایک چھوٹی بیٹھک میں چلا گیا۔ جہاں گملے رکھے تھے اور کوئی نہ تھا۔

بچے بڑے بھولے بھالے تھے اور باوجود اپنی والدہ اور انّا کی کوششوں کے ان پر نہ پڑے تھے۔ اُنھوں نے کرسمس کے درخت کو ایک پل میں صاف کر دیا اور اپنے آدھے کھلونوں کا پیشتر اس کے کہ انہیں اس کا علم ہو کہ کون کس کا ہے وہ خاتمہ کر چکے تھے۔ ان تمام بچوں میں سے ایک بچہ خصوصاً نہایت خوبصورت تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال گھونگھر والے۔ اور وہ اپنی لکڑی کی بندوق سے میری طرف برابر نشانہ لگایا کرتا۔

لیکن جس بچہ میں سب سے زیادہ دلکشی تھی وُہ اس کی بہن تھی جو کیوپڈ کی طرح پیاری تھی۔ وُہ کسی بات پر بچوں سے بگڑ گئی اور اُسی کمرہ میں آگئی جس میں مَیں تھا۔ یہاں وُہ ایک کونے میں اپنی گڑیا لے کر بیٹھ گئی۔

"اُس کا باپ نہایت ہی دولتمند تاجر ہے"۔ مہمان ایک دوسرے سے حیرت کے لہجہ میں کہہ رہے تھے "اس نے اس کے جہیز کے لئے ابھی سے ۳ لاکھ روپے الگ رکھ دیئے ہیں"۔

جو لوگ یہ گفتگو کر رہے تھے ان کی طرف دیکھنے کو جونہی میں مُڑا میری نگاہیں کوہرچ سے دوچار ہو گئیں۔ وُہ اس غیر دلچسپ گفتگو کو بہت توجہ سے اپنے ہاتھ پُشت پر رکھے ہوئے اور سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے سُن رہا تھا اس تمام اثنا میں مَیں اپنے میزبان کی تعریف کرتا رہا کہ اُس نے کس ہشیاری سے انعامات تقسیم کئے تھے۔ لاکھوں روپے والے جہیز کی بچی کو سب سے قیمتی گڑیا ملی تھی۔ اور بقیہ انعامات والدین کی حیثیت کے مطابق تھے آخری بچے کو قدرت کی کہانیوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ملی جس میں تصویریں تک نہ تھیں۔ یہ بچہ دس برس کا تھا۔ اس کا جسم لاغر اور بال سرخ تھے۔ یہ انّا کا بچہ تھا جو ایک غریب بیوہ تھی۔ یہ لڑکا بہت معمولی سی جیکٹ پہنے ہوئے

تھا اور بہت دبا دبا دکھائی پڑتا تھا۔ اُس نے کتاب اُٹھالی اور آہستہ آہستہ بچّوں کے کھلونوں کی طرف گھومنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان بچّوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے بے تاب ہے مگر اُس کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔

مجھے بچّوں کو غور سے دیکھنا اچّھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اپنا سکّہ جمانے کی جو سعی کرتے ہیں اُسے دیکھنے میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ مَیں دیکھ رہا تھا کہ وُہ لال بالوں والا لڑکا دوسرے بچّوں کی چیزیں کتنی للچاتی ہوئی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ خاص کر کھلونوں سے کھیلنے کے لئے وُہ بہت بیقرار تھا۔ چنانچہ وُہ دوسرے لڑکوں کی چاپلوسی کرنے پر بھی تیّار ہو گیا۔ وُہ ایک دفعہ مُسکرایا اور ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اُس کے پاس ایک امرود تھا اُسے اس نے ایک دوسرے بچّہ کو دے دیا جس کی جیبیں مٹھائیوں سے بھری تھیں۔ ایک اور چھوٹے بچّہ کو اُس نے اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا — اور یہ سب وُہ محض اِس لئے کر رہا تھا کہ اُس کو ساتھ کھیلنے کی اجازت مل جائے۔ لیکن تھوڑی دیر میں ایک لڑکے نے اُس کے زور سے ایک گُدّا رسیّد کیا۔ مگر اُس بیچارے کو چیخنے کی بھی ہمّت نہ ہوئی۔ اتنے میں انّا آگئی اور اُس نے اس سے کہا کہ دوسرے لڑکوں کے کھیل میں حصّہ نہ لے۔ چنانچہ وُہ بیچارہ بھی اُسی کمرہ میں آگیا جہاں

ہیں اور وہ لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور دونوں اُس قیمتی گڑیا کو کپڑے پہنانے لگے۔

اس حالت میں تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں اُسی کمرہ میں بیٹھا تقریباً اُونگھ رہا تھا اور اُس دولت مند کمسن حسینہ اور لال بال والے لڑکے کی باتیں بھی کان میں پڑ جاتی تھیں کہ یکایک کوویچ کمرہ میں داخل ہوا جس وقت نیچے کسی بات پر شور مچا رہے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم سے اس کمرہ میں چلا آیا تھا۔ میں نے اپنے اس گوشہ سے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ اس لڑکی کے باپ سے بہت سرگرمی سے گفتگو کر رہا تھا۔ جس سے اُس کا تعارف اُسی وقت کرایا گیا تھا۔

پہلے وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی انگلیوں پر کچھ آپ ہی آپ شمار کر رہا ہے ''تین سو ——— تین سو ——— گیارہ ——— بارہ ——— تیرہ ——— سولہ ——— پانچ برس ہیں! اچھا ۴ فیصدی رکھ لیجئے ——— بارہ پنجے ——— ساٹھ ——— اور اس ساٹھ پر ——— فرض کیجئے کہ ۵ برس ہیں اس کی تعداد ——— سمجھ لیجئے ——— چار سو ہو جائیگی۔ ——— ہوں ——— ہوں! ——— مگر وہ بڈھا خرانٹ ۴ فیصدی پر نہیں راضی

ہونے والا ہے، شاید اُس کو آٹھ یا دس کے حساب سے ملتا ہے۔ فرض کر لیجیے پانچسو یا پانچ ہزار ــــ یہ تو کم از کم یقینی ہے۔ اس کے علاوہ جیب خرچ ــــ ہوں! ــــ"

یہ کمرہ سے پلٹنے ہی والا تھا کہ اُس کی نظر لڑکی پر پڑ گئی اور وُہ وہیں خاموش کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے مَیں چونکہ گملوں کے پیچھے تھا۔ اس لئے وُہ مجھے نہ دیکھ سکا مگر مجھے ایسا نظر آ رہا تھا کہ گویا وُہ کانپ رہا ہے۔ شاید وُہ اپنے اعداد و شمار کی وجہ سے گھبرا سا گیا ہو۔ بہر حال وُہ اپنے ہاتھ ملتا ہوا ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹہلنے لگا اور اس کا جوش بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار اُس نے اپنے جذبات پہ قابو حاصل کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنی ہونے والی بیوی کی طرف غور سے دیکھا اور اُس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر پھر چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور اُس کے بعد گویا ایک گناہگار ضمیر لئے ہوئے وُہ بچّہ کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کی پیشانی پر ایک بوسہ لیا۔

اُس کا اس طرح آنا اس قدر خلافِ توقع تھا کہ لڑکی زور سے چیخ اُٹھی "پیاری بچّی۔ یہاں کیا کر رہی ہو"۔ اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے

اور اس کے گال دباتے ہوئے کہا:۔

بچّی نے جواب دیا "ہم لوگ کھیل رہے ہیں"

"آہا! اس کے ساتھ؟" کووچ نے اناّ کے لڑکے کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

"لڑکے! تم ڈرائنگ روم میں جاؤ" کووچ نے لڑکے سے کہا۔

لڑکا خاموش بیٹھا رہا اور اس اجنبی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کووچ نے ایک مرتبہ پھر ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھا اور لڑکی کی طرف جھک کر کہا:۔

"مائی ڈیر! تم کیا چیز لئے ہوئے ہو۔ گڑیا!!"

"ہاں جناب" لڑکی یہ کہہ کر جھجک گئی اور اس کی ابروؤں پر بل آگئے۔

"اچھّا گڑیا ہے؟ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ گڑیا کیسے بنائی جاتی ہے"؟

"نہیں جناب" اُس نے کمزور آواز میں کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

"چیتھڑوں سے مائی ڈیر" "اے لڑکے تم یا تو ڈرائنگ روم میں چلے چلے جاؤ یا لڑکوں کے پاس" کووچ نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔

مگر یہ بات دونوں بچوں کو بری معلوم ہوئی اور دونوں نے ایکدوسرے کو پکڑ لیا — وہ جدا ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔

"اچھا، تم یہ جانتی ہو کہ تمہیں یہ گڑیا کیوں دی گئی ہے"؟ کوورچ نے اپنی آواز کو اور آہستہ بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں"۔

"کیونکہ تم اس پورے ہفتہ بہت اچھی لڑکی رہیں"۔

یہ کہتے ہی کوورچ کے چہرہ کا رنگ پھر بدلا۔ اُس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور اس قدر آہستگی سے جو سنائی بھی نہ دے کہا:۔

"اگر میں تمہارے ابّا۔ امّاں کے پاس ملنے آؤں تو تم کو اچھا معلوم ہوگا"؟

اُس نے اُس چھوٹی خوبصورت ہستی کو بوسہ دینا چاہا مگر لال بالوں والے لڑکے نے دیکھا کہ وہ رونا ہی چاہتی ہے۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس کی ہمدردی میں زور سے رونے لگا۔ اس پر وہ آدمی بگڑ گیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنے ساتھیوں کے پاس دوسرے کمرہ میں جاؤ"۔

"نہیں، میں نہیں چاہتی کہ وہ جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں سے جائے۔ تم چلے جاؤ۔" لڑکی چلّا کر بولی۔ "اسے رہنے دو۔ اُسے رہنے دو۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ دروازہ پر پاؤں کی چاپ معلوم ہوتی کروچ اُچھل پڑا اور لال بالوں والا لڑکا اور بھی گھبرا گیا۔۔۔۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور دیوار کی طرف بڑھا اور ڈرائنگ روم سے ہوتا ہوا کھانے کے کمرہ میں چلا گیا۔

اس خیال سے کہ کوئی دیکھنے نہ پائے کروچ بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کا چہرہ اس وقت سُرخ ہو رہا تھا اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر خود اُس کی پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ غالباً وہ اپنی بے صبری پر خود ہی ناراض تھا۔ اپنی پوزیشن اور اپنے رتبہ کا خیال کئے بغیر وہ ایک بچّہ کی طرح اپنے مقصود کی طرف جھپٹ پڑا تھا۔ میں ان حضرت کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ رُوم میں چلا گیا اور وہاں عجیب تماشہ دیکھنے میں آیا۔

کروچ جنگی نگاہوں سے قہر ٹپک رہا تھا لڑکے کو ڈانٹنے لگا۔ لال بالوں والا لڑکا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بیچارے کے لئے اور زیادہ ہٹنے کی

جگہ بھی نہ رہ گئی۔

"نکل جا یہاں سے۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔ نکل۔ بدمعاش کہیں کا۔ پھل چُرا رہا ہے۔ ایں؟ بول۔ پھل چُرا رہا ہے۔ نکل خبیث اور جا اپنے دوستوں کے پاس"۔

بیچارہ خوفزدہ لڑکا ڈر کے مارے اُس سے بچنے کے لئے میز کے نیچے گھُس گیا مگر کوڈج کو بے حد غصّہ چڑھا ہوا تھا اور اُس نے اپنے بڑے رومال کو کوڑے کر کٹ کی طرح اُس پر استعمال کر کر کے اُسے باہر نکلنے پر آخر مجبور ہی کر دیا۔

یہاں مَیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہُوں کہ کوڈج کس قدر لحیم شحیم آدمی تھا۔ اُس کے گال پھُولے ہوئے تھے اور گھٹنے وغیرہ گول تھے۔ اس وقت اس کا پسینہ نکل رہا تھا اور وُہ سانس بڑی زور زور سے لے رہا تھا۔ اس لڑکے سے اُس کو اتنی نفرت (یا رقابت؟) تھی کہ وُہ بالکل پاگل کی طرح کام کرنے لگا۔

مَیں یہ دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔ کوڈج نے پلٹ کر دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔ بلکہ تھوڑی دیر کے لئے شاید وُہ اپنی عظیم الشان ہستی کو بھی بھُول

گیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت میزبان صاحب سامنے کے دروازہ سے نکلے۔ لڑکا میز کے نیچے سے نکلا اور اپنی کہنیاں اور گھٹنے صاف کئے۔ کووچ نے جلدی سے اپنا رُومال اٹھایا جس سے وُہ بچّہ کو مار رہا تھا۔ ہمارے میزبان نے ہم تینوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ مگر ایک زمانہ ساز آدمی کی طرح اُس نے اس موقعہ سے یہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی کہ وُہ اپنے معزّز مہمان پر اپنا قابو جمالے اور اُس سے اپنا کام نکال لے۔

"یہ دیکھئے۔ یہ وہی لڑکا ہے۔ جس کی بابت مَیں آپ سے عرض کر رہا تھا۔" اُس نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں"۔ کووچ نے جواب دیا۔ ابھی تک اس کی سانس ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔

"یہ میری انّا کا لڑکا ہے۔" میزبان نے نہایت عاجزی کے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "وُہ بیچاری بہت غریب ہے۔ ایک ایماندار افسر کی بیوہ۔ اسی وجہ سے اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو ـــ"

"بالکل ناممکن! بالکل ناممکن! فلپ الیکسیوچ! معاف کرنا۔ مَیں یہ نہیں کر سکتا۔ مَیں نے دریافت کیا تھا۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور دس

آدمیوں کا نام اُمیدوارون کی فہرست میں پہلے ہی سے موجود ہے جو زیادہ مستحق ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ کیا بتاؤں!"

"یہ تو بہت بُرا ہُوا" ہمارے میزبان نے کہا۔ "یہ بیچارہ بڑا سیدھا لڑکا ہے۔"

"مگر میرے خیال میں تو بڑا پاجی ہے" گووچ نے کہا۔ "جا یہاں سے لڑکے۔ ابھی تک یہاں کیوں موجود ہے؟ جا دوسرے لونڈوں کے پاس"

اس کے بعد وہ ضبط نہ کر سکا اور میری طرف کنکھیوں سے دیکھا میں بھی اپنے اُوپر قابو نہ حاصل نہ کر سکا اور ہنسنے لگا۔ اُس نے پلٹ کر میزبان سے دریافت کیا کہ یہ نوجوان آدمی کون ہے۔ دونوں نے پھر آہستہ سے کچھ باتیں کیں اور میری پروا کئے بغیر کمرہ چھوڑ دیا۔

مَیں ہنسی کے مارے بیتاب ہو گیا اور پھر ڈرائینگ رُوم میں چلا گیا۔ یہاں یہ بزرگوار ایک خاتون سے جن سے اُن کا اُسی وقت تعارف کرایا گیا تھا گھُل مِل کر باتیں کر رہے تھے۔ یہ خاتون اُس دولتمند چھوٹی بچّی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ گووچ، بچی کی خوبصورتی، اُس کی عقل، اُس کی تہذیب اُس کی تمیز کی تعریف کر رہا تھا جس سے مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ ماں پگھل جائے

چنانچہ وُہ اپنی چھوٹی لڑکی کی تعریفیں سُن سُن کر خوشی کے مارے پھُولے نہ سماتی تھی اور اُس کی آنکھ سے خوشی کے آنسو نکلے پڑتے تھے۔ بچی کا باپ بھی اپنے تبسّم سے اپنی مسرّت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے بعد مَیں نے سُنا کہ بچّی کی ماں نے جس پر خاص اثر ہوُا تھا نہایت شُستہ الفاظ میں اور بہت اخلاق کے ساتھ کوورچ سے درخواست کی کہ وُہ ان کے یہاں آکر ان کی عزّت افزائی کا موقعہ دے۔ کوورچ نے نہایت گرمجوشی سے اس دعوت کو منظور کر لیا اور اتنے میں مہمان اُس جگہ سے منتشر ہو گئے۔ پھر میں یہ سنتا رہا کہ سب کے سب اس تاجر، اُس کی بیوی، اس کی لڑکی اور خاص کر مسٹر کوورچ کی بہت ادب سے اور بہت پُر زور الفاظ میں تعریفیں کر رہے ہیں۔

"کیا اس کی شادی ہو چکی ہے"؟ مَیں نے اپنے ایک ملاقاتی سے جو کوورچ کے پاس کھڑا تھا زور سے دریافت کیا۔ کوورچ نے میری طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں"۔ میرے دوست نے جواب دیا۔ میری اس ارادی بے عنوانی پر اُسے سخت حیرت تھی۔۔۔۔ کچھ عرصہ کے بعد مَیں ۔۔۔ کے گرجے کی طرف گزرا

وہاں مَیں نے دیکھا کہ ایک شادی کو دیکھنے کے لئے صدہا آدمیوں کا اجتماع ہے۔ اُس روز موسم ناخوشگوار تھا۔ پانی برسنا شروع ہو گیا تھا۔ مَیں مجمع سے ہوتا ہوا گرجے کے اندر داخل ہو گیا۔ دولہا ایک گول بدن کا، موٹا سا، پستہ قد آدمی تھا۔ وُہ اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا اور احکامات دیتا پھرتا۔ آخر کار اطلاع ملی کہ دلہن آ رہی ہے۔ مَیں مجمع کو چیرتا ہؤا سامنے آ گیا اور دیکھا کہ میری نظروں کے سامنے ایک مجسمۂ حسن و جمال چلا آ رہا ہے۔ جس کے حُسن کی پہلی بہار بھی ابھی مشکل سے شروع ہوئی ہوگی۔ مگر یہ پیکرِ حُسن رنجیدہ معلوم ہو رہا تھا اور اس کے چہرہ پر زردی تھی اور مجھے تو ایسا نظر آ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں ابھی ابھی رونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کے چہرہ کا ہر خط اُس کے حُسن کی سنجیدگی میں اضافہ کر رہا تھا۔ مگر اُس سنجیدگی اور اس رنج میں بچپن کی معصومیت ہویدا تھی۔ اُس کے خط و خال میں کچھ ناقابلِ بیان سادگی پائی جاتی تھی۔ جو اپنی خاموش زبان میں دوسروں سے رحم کی التجا کر رہی تھی۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ دلہن صرف ۱۶ برس کی ہے۔ مَیں نے دولہا کی طرف غور سے دیکھا۔ یکایک مَیں نے جولین ھسٹا کووِچ کو پہچان لیا جس کو مَیں نے ان پانچ سال کے دوران میں ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا

تھا۔ اس کے بعد میں نے دُلہن کی طرف پھر غور کر کے دیکھا۔ اللہ کی پناہ! جتنی جلد مجھ سے ہو سکا۔ گرجے سے بھاگا۔ مجمع میں لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ "دُلہن بہت مالدار ہے ـــ ۵ لاکھ روبل جہیز میں ملا ہے۔ اتنا اتنا جیب خرچ کے لئے ہے"

"اس کا اندازہ ٹھیک تھا"ـــ جب میں سڑک پر آگیا تو میں نے خیال کیا۔

(ایم ڈوسٹوئیوسکی)

(نگار دسمبر ۱۹۳۶ء)

# انقلابی

ماسٹر گرائیل اینڈرسن اسکول کے باغ کے کنارے تک گیا اور وہاں پہنچکر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ دُور، فاصلہ پر، دو میل کے قریب خالص برفیلے کھیت پر درختوں کی شاخیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے کسی سفید چادر میں نیلی لیس ٹانک دی گئی ہو۔ بہت خوشگوار تھا۔ سفید زمین اور باغ کے لوہے کے جنگلے کی سلاخوں پر ہر جگہ زنگ ہی زنگ نظر آتا تھا، ہوا میں وہ ہلکاپن تھا جو صرف موسم بہار میں پایا جاتا ہے۔ اینڈرسن نے جنگل میں چہل قدمی کے لئے اپنے قدم اس نیلی لیس کی طرف موڑ دیئے۔

"میری زندگی میں دوسری بہار!" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اور اپنے چشموں کے شیشوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اینڈرسن کی طبیعت میں جذباتی شاعری پائی جاتی تھی وہ اپنے ہاتھ پشت پر کیے ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اسے باغ کے دوسری طرف سڑک پر سواروں کی جماعت دکھائی پڑی، ان کی بھوری سیاہی مائل وردی سفید برف میں بالکل الگ نظر آ رہی تھی۔ اینڈرسن بہت متعجب تھا کہ یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ کہ یکایک ان کا مقصد اسے سمجھ میں آ گیا۔ وہ کسی مکروہ کام کے لئے نکلے ہیں، یہ خیال کسی خاص بنا پر نہیں بلکہ ایک اندرونی تحریک سے اس کے دل میں آیا۔ کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ ہونے والا ہے، اور اسی تحریک نے اسے مجبور کیا کہ وہ سپاہیوں سے پوشیدہ ہو جائے وہ جلدی سے بائیں طرف گھوما، گھٹنوں کے بل جھکا اور برف پر رینگتا ہوا ایک گھاس کے گٹھے تک پہنچ گیا جس کے نیچے سے وہ اپنی گردن اٹھا اٹھا کر یہ دیکھ سکتا تھا کہ سپاہی کیا کر رہے ہیں۔

سپاہی تعداد میں ۱۲ تھے۔ ان کا افسر ایک جوان آدمی تھا۔ جو

خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا اور کمر میں ایک روپہلی پٹی لگی تھی۔ اس کا مُنہ اتنا سُرخ تھا کہ اینڈرسن دُور سے اس کی نکلی ہوئی مونچھوں اور ابروؤں کی سفیدی مائل چمک کو اس کے حلیہ کے مقابلہ میں دیکھ لیا۔ اس کی بھاری آواز کا شکستہ لہجہ اس جگہ صاف سُنائی پڑ رہا تھا جہاں اسٹر چھپا ہُوا لیٹا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کس کام کے لیے آیا ہوں، مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔" افسر نے چلّا کر کہا۔ اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اور سپاہیوں میں کسی طرف دیکھا۔ "تو سہی بتاؤں گا تجھے کہ باغی ہونے کا کیا مزا ملتا ہے۔ سؤر کہیں کا۔"

اینڈرسن کا دل اُچھلنے لگا۔ اللہ توبہ! اس نے خیال کیا کیا یہ ممکن ہے؟ وُہ اپنے سر میں سردی محسوس کرنے لگا، گویا ٹھنڈک کی ایک لہر آکر ٹکرا گئی ہو۔

افسر صاحب! ایک خاموش تھی ہوئی مگر صاف آواز سپاہیوں کے حلقہ سے آئی۔ "آپ کو کوئی حق نہیں ہے —— عدالت یہ فیصلہ کر سکتی ہے —— آپ جج نہیں ہیں —— یہ صاف قتل ہے نہ کہ ——"

"چُپ"! افسر گرج کر بولا، اس کی آواز غصہ کے مارے بیٹھی جا رہی

تھی، مَیں تمہارے لئے عدالت قائم کئے دیتا ہوں ——— آؤ تو آگے بڑھو
اُس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا اور آگے بڑھ گیا، اینڈرسن نے
بھی دیکھا کہ گھوڑا اپنے راستہ پر کیسی ہوشیاری سے چل رہا تھا اور اس کے
قدم ایسی نزاکت سے اُٹھ رہے تھے گویا ناچ کے لئے اُٹھائے جاتے ہوں
اور اس کے کان ہر آواز سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، سپاہیوں میں اس
وقت تھوڑی دیر کے لئے ایک ہاہمی پیدا ہو گئی اور وُہ پھر مختلف سمتوں میں
منتشر ہوئے، ان کے پیچھے تین آدمی کالے کپڑے پہنے رہ گئے۔ جن میں دو
لانبے تھے، اور ایک بہت پستہ قد اور دُبلا، اینڈرسن چھوٹے قد والے
آدمی کے سر کا بال دیکھ سکتا تھا، یہ بہت ہلکے تھے۔ اینڈرسن نے اس کے
کان بھی دیکھ لئے۔

اب وُہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے، لیکن یہ بات اس قدر
غیر معمولی اور خوفناک تھی کہ اسے یہی خیال ہُوا کہ شاید خواب دیکھ رہا ہے۔
کتنا صاف مطلع ہے ——— کتنا خوبصورت، برف کھیت، جنگل، آسمان
ہر چیز پر بہار چھائی ہوئی ہے، مگر پھر بھی لوگ قتل ہونے والے ہیں، یہ کیسے
ہو سکتا ہے، ناممکن! اس کے خیالات پریشان ہو گئے اور وُہ اپنے آپ کو

ایسا محسوس کرنے لگا گویا یکایک اِس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

یہ تینوں آدمی بنگلے کے پاس ایک دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے تھے، دو تو بالکل قریب تھے اور ایک کچھ دُور تھا۔

افسر! ان میں سے ایک شخص مایوسی کے لہجہ میں بولا — اینڈرسن یہ دیکھ پایا کہ وُہ کون تھا۔ خدا ہم سب کو دیکھ رہا ہے — افسر!" آٹھ سپاہی، آہنی تلواریں بھدّے طریقے سے پکڑے فوراً گھوڑوں سے اُترے معلوم ہوتا تھا کہ وُہ بہت جلدی میں ہیں اور جلدی سے کوئی کام کر رہے ہیں۔

کئی سیکنڈ خاموشی میں گزر گئے جس کے بعد سپاہی ان سیاہ پوشوں سے چند فٹ کے فاصلہ پر قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے اور ان کی طرف نشانہ باندھا، مگر اس وقت ایک سپاہی کی ٹوپی سر سے گر پڑی اس نے اسے اُٹھا کر برف صاف کی اور پھر اسے پہن لیا۔

افسر کا گھوڑا ابھی تک ایک جگہ ناچ رہا تھا۔ اس کے کان اِسی طرح کھڑے ہُوئے تھے دوسرے گھوڑے بھی جن کے تیز کان ہر آواز کے سننے کے لئے اُٹھے ہُوئے تھے اپنی جگہ پر خاموش کھڑے انہیں سیاہ پوشوں

کو دیکھ رہے تھے۔

"کم از کم بچّہ کو تو چھوڑ دو" ایک دوسری آواز یکایک فضا میں گونجی۔ "پاجی بچّہ کو کیوں مار رہا ہے۔ اس نے کیا قصور کیا ہے"؟

"آؤ تو جو کچھ مَیں نے تمہیں حکم دیا ہے وُہ کرو" افسر نے اس طرح چلّا کر کہا کہ دوسری آواز اِس میں گُم ہو گئی، اس کا چہرہ سرخ فلالین کی طرح لال بھبھوکا ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ایسا منظر دکھائی پڑا جو اپنی شقاوت میں انتہائی وحشیانہ اور نفرت انگیز تھا۔ پستہ قد سیاہ پوش نے بچّوں کی طرح ایک چیخ نکالی اور ایک طرف گر پڑا۔ مگر فوراً ہی دو یا تین سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا، لڑکا ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور دوسرے سپاہی دوڑ پڑے۔

"اُو۔ اُو۔ اُو۔ اُو" لڑکا چیخنے لگتا ہے۔ "مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ اُو۔ اُو" اُس کی چیخ ہوا میں اس طرح گونجنے لگی۔ جیسے کسی ذبیحہ کی چیخ جو پوری طور سے ہلاک نہ کیا گیا ہو۔ یکایک وُہ خاموش ہو گیا۔ یقیناً کسی شخص نے اُس کا خاتمہ کر دیا ہو گا۔ ایک خلافِ توقع اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ لڑکا آگے کو دھکیلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک کان

پھاڑ دینے والی آواز آئی۔ اینڈرسن کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے صاف طور سے۔ گو ایک خواب کی طرح۔ دونوں آدمیوں کو زرد چنگاریوں کی چمک۔ اور ایک صاف چمکیلی فضا میں گرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ سپاہی ان لاشوں کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ اُس نے ان کو کیچڑ سے بھری سڑک پر گھوڑا سرپٹ دوڑاتے دیکھا، ان کے ہتھیار بج رہے تھے، اور ان کے گھوڑوں کے سُم سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اس نے یہ سب بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ وُہ یہ خود نہ سمجھ سکا کہ گھاس کے گھٹے کے پیچھے سے کب اور کیوں کود کر باہر نکل آیا تھا، اس کا چہرہ پسینہ سے تر تھا اور اس کا بدن کانپ رہا تھا ایک عجیب قسم کی جسمانی تکلیف اس کو ستا رہی تھی وُہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہے۔ اس کی حالت ایک سخت بیمار کی طرح تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

جب سپاہی جنگل میں غائب ہو گئے تو گولی چلنے کی جگہ پر لوگ جلدی جلدی پہنچنے لگے اگرچہ گولی چلنے تک ایک آدمی بھی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

لاشیں جنگلے کے دوسری طرف سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ برف بھربھری تھی اور صاف فضا میں چمک رہی تھی، یہ لاشیں تین انسانوں کی تھیں، دو آدمیوں کی اور ایک بچّہ کی، لڑکے کی لانبی نرم گردن برف پر پڑی ہوئی تھی، لڑکے کے قریب جو آدمی تھا اس کا چہرہ چھپا ہُوا تھا اور اوندھے مُنہ خون کے ایک تالاب میں پڑا ہوا تھا۔ مقتول اچھّے قد و قامت کا آدمی تھا۔ اس کی داڑھی سیاہ اور بازو مردانہ تھے، وُہ لمبا لمبا پڑا ہوا تھا، اور اس کے ہاتھ خون آلود برف پر پھیلے ہُوئے تھے، اس نیلی سڑک کے کنارے جہاں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان کے اس طرح خاموش پڑے رہنے میں جو خوف معلوم ہوتا تھا۔ اس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

اس رات کو انیڈرسن نے اپنے اسکول کے کمرہ میں حسبِ معمول اشعار نہیں لکھے، وُہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر نیلے آسمان پر اپنے سے دُور چاند کے زرد ہالہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اس کے خیالات منتشر ڈراؤنے اور ایسے خوفناک ہو گئے تھے کہ اس کا سر جکڑا رہتا، وُہ ایسا محسوس کر رہا تھا گویا وُہ اب بھی انہیں تینوں آدمیوں کو جن کو گولی ماردی گئی تھی

دیکھ رہا ہے، جو کھیت میں پڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے چاند کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"کبھی وُہ زمانہ آئیگا۔" اُس نے خیال کیا۔ جب دوسروں کے ہاتھوں سے لوگوں کا قتل بالکل ناممکن چیز ہو جائیگا۔ وقت آئیگا جب اِن سپاہیوں اور افسروں کو جنہوں نے ان تینوں آدمیوں کو مارا ہے پتہ چل جائیگا کہ اُنہوں نے کیا کیا ہے اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ جس چیز کے لیئے انہوں نے ان کو قتل کیا ہے۔ وُہ ان کے لئے بھی ایسی ضروری، اہم اور عزیز ہے جتنی ان کیلئے جنہیں اُنہوں نے مار ڈالا ہے"۔

"ہاں"۔ اُس نے زور سے اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ "وہ وقت آئیگا"۔ چاند کا زرد ہالہ اس کی آنکھوں کی رطوبت کی وجہ سے داغدار معلوم ہونے لگا۔

ان تینوں مظلوموں کے لیئے اس کا دل رنج سے بھر آیا۔ اس کے دل میں غصّہ کی ایک لہر موجزن ہوگئی مگر پھر اُس نے اپنے دل پر قابو حاصل کیا اور آہستہ سے کہا :-

"وہ جو کچھ کر رہے ہیں جانتے ہیں"۔ اس پُرانے فقرہ نے اُسے اپنے غصّہ

پر قابو رکھنے کی قدرت دے دی۔

(۲)

مطلع اسی طرح صاف اور خوشگوار تھا مگر بہار کے دن زیادہ گزر چکے تھے۔ بھیگی ہوئی زمین سے بہار کی خوشبو آرہی تھی۔ برف کے نیچے سے صاف اور ٹھنڈا پانی ہر جگہ بہتا تھا۔ درختوں کی شاخیں بہار کا نقشہ پیش کر رہی تھیں اور لچکدار ہو گئی تھیں۔ میلوں تک زمین کے صاف اور نیلگوں قطعات پھیلتے چلے گئے تھے۔ لیکن گاؤں میں بہار کی صفائی اور خوشی نہ تھی۔ یہ چیزیں گاؤں کے باہر جہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ پائی جاتی تھیں یعنی کھیتوں، جنگلوں اور کہساروں میں۔ گاؤں میں ہوا دم بند بھاری اور ڈراؤنی تھی جیسے کسی خواب میں ہو۔

اینڈرسن سڑک پر ایک پریشان دماغ لوگوں کے مجمع کے قریب کھڑا ہوا تھا اور سات کاشتکاروں کو کوڑے مارنے کے لئے جو انتظامات کئے جا رہے تھے ان کو گردن آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

وہ برف میں کھڑے ہوئے تھے۔ اینڈرسن کو معلوم ہو گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وہ عرصہ سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس خوفناک اور شرمناک چیز کی

بدولت جو اُن پر گزرنے والی تھی۔ وُہ لوگ تمام دُنیا سے جُدا کر دیئے گئے تھے اور اسی لئے وُہ اس چیز کا احساس نہیں کر سکتے تھے جس کا اینڈرسن کرتا تھا۔ اور اسی طرح اینڈرسن وُہ چیز نہیں سمجھ سکتا تھا جو اُن کے دلوں میں تھی۔ ان کے چاروں طرف سپاہی بڑے بڑے گھوڑوں پر نہایت خوبصورتی سے کھڑے ہُوئے تھے۔ یہ گھوڑے اپنے سر ہلا رہے تھے۔ اپنے چہرے اِدھر اُدھر گھماتے تھے اور اینڈرسن کو نظرِ حقارت سے دیکھ رہے تھے کہ وُہ عنقریب اس ظلم و ستم کو دیکھے گا مگر کچھ نہ کر سکے گا۔ اینڈرسن کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہُوا اور اس کے آتے ہی ایسا معلوم ہُوا کہ گویا ندامت اور شرمساری نے برف کے دو ٹکڑوں میں اُسے دبوچ لیا ہے۔

سپاہیوں نے ایک کاشتکار کو پکڑا۔ اینڈرسن نے اس کی مترحم نظریں دیکھیں۔ اس کے لب ہلے کوئی لفظ نہیں سُنائی دیا اور اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ان میں اس قسم کی جھپک پائی جاتی تھی۔ جیسے پاگل کی آنکھ میں ہوتی ہے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کے چہرے سے فراست اور پاگل پن دونوں اس قدر عیاں

تھے کہ جب سپاہیوں نے اُسے برف پر اُلٹا لٹا دیا اور بجائے ان آتشیں آنکھوں کے اُس نے اُس کی ننگی پیٹھ چمکتی ہوئی دیکھی (جو ایک نہایت خوفناک اور شرمناک منظر تھا) تب جا کر کہیں اُسے اطمینان ہوا۔

ایک سپاہی جس کا چہرہ سُرخ اور بڑا سا تھا اور جو ایک سُرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس کی طرف بڑھا اور اُس کے بدن کی طرف بہت خوش خوش دیکھنے کے بعد پکار کر صاف آواز میں کہا:۔

"اچھا — خدا کی مہربانی سے اسے جانے دو"۔

انڈرسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ نہ سپاہی کو دیکھ رہا ہے، نہ گھوڑے کو اور نہ مجمع کو۔ اُسے نہ سردی معلوم ہو رہی تھی، نہ خوف اور شرم، نہ وہ فضا میں کوڑے کی آواز سُن سکا اور نہ درد و رنج کی تکلیف دہ کراہ۔ اُس نے صرف ایک آدمی کی ننگی پیٹھ کو دیکھا اور اُس پر کوڑوں کے سفید اور زرد نشان دیکھے۔ رفتہ رفتہ اس ننگی پیٹھ کی صورت بدل گئی۔ خون جسم سے اُچھل رہا تھا اور سفید برف کو رنگین بنا رہا تھا۔

اینڈرسن کی رُوح خوف سے کانپنے لگی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اُس نے انہیں پھر کھولا تو دیکھا کہ چار اور سپاہی جو سُرخ

لباس میں ملبوس ہیں۔ ایک دوسرے آدمی کو برف پر ٹپک رہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر اسی بے شرمی، بدتمیزی اور بہیمیت سے اُس کی پیٹھ کو عُریاں کیا ـــ کس قدر پُردرد نظّارہ تھا۔

اس کے بعد تیسرے کی باری آئی۔ پھر چوتھے کی اور یوں ہی ساتوں کی۔

اینڈرسن بھیگے ہُوئے برف پر یوں ہی کانپتا۔ تھرتھراتا۔ اور اپنی گردن بلند کرتا کھڑا رہا اور اس تمام اثنا میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ نکل رہا تھا۔ وُہ اس وقت شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ اُس کے لئے یہ چیز نہایت شرمناک تھی۔ کہ وُہ اس ڈر سے سامنے نہیں آیا کہ کہیں وُہ لوگ اسے بھی نہ پکڑ لیں اور برف پر لٹا کر اُسے ننگا کر دیں۔

سپاہی بڑھتے گئے۔ گھوڑے اپنا سر اِدھر اُدھر جھٹکتے رہے۔ کوڑے کی آواز فضا میں اسی طرح گونجتی رہی اور عُریاں انسانی گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا اُس کا خون بہایا اور اس کا بدن سانپ کی طرح اینٹھایا جاتا رہا۔

اینڈرسن نے پھر پانچ آدمیوں کے چہرے ٹاؤن ہال کے زینوں

پڑ دیکھے۔ یہ چہرے ان آدمیوں کے تھے جن کو اس شرمناک حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیرلیں۔ "یہ دیکھنے کے بعد ایک آدمی کو مرجانا چاہئے"۔ اُس نے خیال کیا۔

(۳)

وُہ لوگ سترّہ تھے۔ ۱۵ سپاہی، ایک نائب اور ایک بے ریش افسر۔ یہ افسر آگ کے سامنے لیٹا ہوا شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہی ہتھیاروں کو ٹھیک کر رہے تھے۔

وُہ لوگ سیاہ پگھلنے والی زمین پر خاموشی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے اور کبھی کبھی دہکتی ہوئی آگ میں سے جو لٹھے نکلے ہوئے تھے۔ اُن سے لڑ جاتے تھے۔

اینڈرسن اپنا اوورکوٹ پہنے اور اپنی چھڑی اپنی پشت پر لئے ان کے قریب آیا۔ ماتحت (ایک موٹا تازہ مونچھوں والا آدمی) اُٹھ بیٹھا اور آگ کی طرف سے اپنا منہ ہٹا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" اُس نے بڑی جلدی جلدی دریافت کیا۔ اُس کے لہجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ضلع میں جہاں وُہ ہلاکت

تباہی اور بربادی پھیلاتے جاتے ہیں۔ سپاہی ہر ایک سے خوف کھاتے تھے۔

"افسر!" اُس نے کہا۔ "یہاں ایک آدمی ہے جسے مَیں نہیں جانتا۔"
افسر نے اینڈرسن کی طرف بغیر کچھ بات کئے دیکھا۔

"افسر صاحب!" ایک باریک آواز میں کہا "میرا نام نکلسن ہے میں ہال کا تاجر ہوں۔ اور تجارت ہی کے سلسلہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ شاید مجھے کوئی اور نہ سمجھ لیا جائے۔ سمجھے آپ!"

"تو تم یہاں کیا بکواس لگائے ہوئے ہو؟" افسر نے غصہ ہو کر کہا اور مُنہ پھیر لیا۔

"ہوں — تاجر ہیں!" ایک سپاہی نے نہایت حقارت سے کہا۔ "اس کی تلاشی لینا چاہیئے۔ اس تاجر کی بناکہ وُہ رات کو اِدھر اُدھر نہ پھرتا رہے اُسے شاید اس کی ضرورت کہ اُس کے جبڑے پر ایک مکّا دیا جائے۔"

"یہ مشکوک آدمی ہے افسر!" نائب نے کہا "آپ کی کیا رائے ہے۔ ہم اسے گرفتار کرلیں جی۔"

"نہیں"۔ افسر نے سُستی سے جواب دیا۔ "مَیں ان لوگوں سے عاجز

گیا ہوں — مار دو گولی"۔

اینڈرسن بغیر کچھ اور کہے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں آگ کے پاس عجیب طرح سے چمک رہی تھیں اور اس لمبے قد، صاف اور مضبوط جسم والے انسان کو رات کے وقت سپاہیوں نے اپنا اوورکوٹ اور بید لئے اور آگ کی روشنی میں اُس کی عینک کے شیشے چمکتے ہوئے دیکھنا عجیب منظر تھا۔

سپاہیوں نے اُسے یونہی رہنے دیا اور آگے بڑھ گئے۔ اینڈرسن تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے ہٹ آیا اور جلدی سے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ ہوا سرد ہونے لگی تھی اور جھاڑیوں کی نوکیں زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اینڈرسن پھر فوجی جیپ کی گیا، لیکن اس مرتبہ وُہ چھپ گیا اور جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے جُھکے جُھکے آنے جانے لگا۔ اُس کے پیچھے آہستہ آہستہ اور خاموشی سے جھاڑیوں کو جھکاتے اور سایہ کی طرح خاموشی سے چلے آ رہے تھے۔ گبرائیل کے قریب اُس کی داہنی طرف ایک طویل آدمی اپنے ہاتھ میں ریوالور لئے ٹہل رہا تھا۔

پہاڑی پر سپاہی کی ایک شکل عجیب طرح سے کھڑی دکھائی پڑی اور بالکل غیر متوقع طور پر۔ وُہ سپاہی اُس جگہ نہ تھا جہاں سے وُہ اُسے دیکھ رہے تھے۔ بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں اس کی شکل دھندلی دھندلی دکھائی پڑتی تھی۔ اینڈرسن سپاہی کو پہچان گیا۔ یہ وہی تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ اس کی جامہ تلاشی لی جائے اُسے دیکھ کر اینڈرسن کے دل میں کوئی تلاطم نہیں برپا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوتے ہوئے آدمی کی طرح سرد اور بے حرکت تھا۔ آگ کے چاروں طرف بجز نائب کے جو اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور تمام سپاہی سو رہے تھے۔

اینڈرسن کے داہنے پر جو لانبا دُبلا سا آدمی تھا۔ اُس نے ریوالور اُٹھایا اور لبلبی دبا دی۔ ایک عارضی اندھا بنا دینے والا شعلہ۔ ایک زوردار کان کے پردہ پھاڑ دینے والی آواز!

اینڈرسن نے دیکھا کہ گارڈ نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پھر زمین پر اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سے چنگاریاں چمکیں اور ایک زبردست دھماکا پیدا ہوا۔ نائب کھڑا ہو گیا اور آگ میں گر پڑا۔ بھورے سپاہی بھوت کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اپنے ہاتھ ٹیکنے لگے اور سیاہ زمین پر گر گر

لوٹنے لگے۔ نوجوان افسر اینڈرسن کے پاس دوڑا۔ وہ اپنے ہاتھ ایک اجنبی اور خوفزدہ چڑیا کی طرح ہلا رہا تھا۔ اینڈرسن نے اپنا بید اُٹھایا اور اپنی پوری قوّت سے اس نے افسر کے سر پر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب پر بُھٹ سے آواز ہوتی تھی۔ افسر دوسرے وار کے بعد چکّر کھا کر گھوما اور جھاڑی سے ٹکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جیسے بچے کرتے ہیں۔ کوئی اس طرف دوڑا اور گولی چلادی جو ایسا معلوم ہوا گویا اینڈرسن کے ہاتھوں سے چلی ہے۔ افسر لڑکھڑایا اور زمین پر سر کے بل گر پڑا۔ اس کے پاؤں کچھ دیر تک جھٹکا کھاتے رہے اور پھر وُہ خاموش ہوگیا۔

گولیاں چلنی بند ہوگئیں۔ کالے آدمی جن کے چہرے سفید تھے سپاہیوں کی مُردہ لاشوں کے درمیان چل رہے تھے اور کارتوس وغیرہ لے رہے تھے۔ اینڈرسن یہ سب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب سب ختم ہوگیا تو وُہ اُوپر گیا۔ نائب کے پیر پکڑے اور کوشش کی کہ جسم کو آگ سے نکال لے مگر وُہ اس کے لئے بہت بھاری تھا۔ چنانچہ اُس نے اُسے وہیں چھوڑ دیا۔

(۴)

اینڈرسن ٹاؤن ہال کے زینہ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اُس نے بہت بُری بات کی مگر پھر بھی اس کے دل میں نہ رحم تھا نہ شرم اور نہ افسوس۔ اگر اُسے آزاد کر دیا جائے تو وہ سمجھتا تھا کہ وُہ پھر وہی کرے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنا معائنہ کرے اور دیکھے کہ اُس کی رُوح کے اندر کیا ہو رہا ہے مگر اس کے خیالات بہت منتشر تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اُس کے لیے ان تینوں آدمیوں کے متعلّق سوچنا جو برف پر پڑے ہوئے اپنی مُردہ اور بے نُور آنکھوں سے دُور دراز چاند کے زرد ہالہ کو دیکھ رہے تھے اُس مردہ افسر کے متعلّق سوچنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا جس کے سر پر اس نے دو بھدّے وار کیے تھے اپنی موت کا وُہ خیال نہیں کر رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے ہر چیز کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُسے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ کوئی شئے مر گئی ہے۔ چلی گئی ہے اور اُسے خالی چھوڑ گئی ہے اور اسے اس کی نسبت خیال ہی نہ کرنا چاہیے۔

پھر جب وُہ اُسے گھسیٹ کر لے جانے لگے تو وُہ کھڑا ہو گیا لوگ جلدی سے اُسے باغ سے لے جانے لگے۔ جہاں کے لئے اپنے خشک سر اُٹھائے ہوئے

تھے تو اس کے دل میں ایک خیال بھی نہ آیا۔

اُسے سڑک پر لے جایا گیا اور جنگلہ کے پاس ایک سلاخ سے پشت لگا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے اپنی عینک لگالی۔ ہاتھ پیچھے کر لئے اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر تھوڑا سا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ آخری لمحہ میں اس نے اپنے سامنے نظر کی اور دیکھا کہ رائفلوں کی نالیاں اس کے سر، سینہ اور پیٹ کی طرف ہیں۔ اس کے بعد اُس نے یہ بھی صاف صاف دیکھا کہ ایک رائفل جو اس کی پیشانی کے مقابلہ میں تھی یکایک جھک گئی۔

اینڈرسن کے دماغ میں ایک پُر اسرار خیال جو دنیاوی نہ تھا یکایک آیا۔ اُس نے اپنے چھوٹے قد کو پوری طرح سے تان دیا اور فخر کے ساتھ اپنا سر سیدھا کر دیا۔ طاقت اور فخر کا ایک پُر اسرار خیال اُس کی رُوح میں موجزن ہو گیا اور اس کے نزدیک ہر چیز۔ سورج، آسمان، زمین، انسان اور موت معمولی وہ راز کار اور بیکار نظر آنے لگی۔ گولیاں اُس کے سینہ، اُس کی بائیں آنکھ، اُس کے پیٹ اور صاف کوٹ پر پڑیں۔ اُس کی عینک ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ اُس نے ایک مرتبہ چکّر کھایا اور گر پڑا۔ اُس کی ایک آنکھ اب بھی بالکل کھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کو پکڑنے لگا

جیسے وہ کسی چیز کا سہارا لے رہا ہو۔ افسر اُس کی طرف دوڑا اور اُس کی گردن پر ریوالور رکھ کر دو فائر داغ دیے ...... ابنڈرسن زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

سپاہی اُسے چھوڑ کر جلدی سے چلے گئے مگر ابنڈرسن زمین پر پڑا رہا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی پہلی اُنگلی دس سیکنڈ تک تڑپتی رہی۔

(ماڈکیل۔ پی۔ آرٹزیبشو) (نگار فروری ۳۷ء)

# پچوڑ فرشتہ

عزیز۔ اگر فرشتے واقعی ایسے ہی حسین وجمیل ہیں جیسا کہ نقاشوں کے موقلم ظاہر کرتے ہیں یا جس طرح معابد وکنائس کے دیواروں پر منقوش نظر آتے ہیں۔ تو اے پیاری نسیمہ اس میں کلام نہیں کہ تُو فرشتہ ہے۔

نسیمہ۔ اے پیارے عزیز! اگر خدا ویسا ہی حسن وجمال والا، ویسا ہی حکمت وفراست والا، اور ویسا ہی قوت وجبروت والا ہے۔ جیسا کہ میں نے "اساطیر اولین" میں پڑھا ہے تو اس میں شک نہیں کہ تُو میرا خدا ہے۔

عزیز۔ اے نسیمہ! تو میری محافظ فرشتہ ہے جو میری رنج وراحت، میرے

نوم و بیداری میں ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اگر تُو نہ ہوتی تو میری زندگی ریگزار کی طرح سنسان ہوتی اور رُوح ویرانہ کی طرح وحشتناک۔ یہ تُو ہی ہے جس نے صرف اپنے تبسّم سے میری حیات کو یکسر باغ و بہار بنا دیا۔"

**نسیمہ** "اے عزیز! تُو ہی میرا معبود ہے کیونکہ تُو ہی نے سب سے پہلے میرے قلب میں محبّت کی شعاعیں پیدا کر کے اُسے فنا ہونے سے بچا لیا۔ اور اس لئے اب اے میرے خدا، اے میرے معبود، مَیں اس قلب کو تیری ہی محبّت کی قربانگاہ پر چڑھاتی ہُوں اور اس ہدیۂ حقیر کے قبول کئے جانے کی متمنی ہوں۔"

**عزیز** "اے نسیمہ! حقیقت یہ ہے کہ تُو ایک پاک فرشتہ ہے۔"

**نسیمہ** "اے عزیز! یہ واقعہ ہے کہ تُو میرا معبودِ قلب و روح ہے۔"

یہ تھی دو محبّت کرنے والوں کی گفتگو جو دس دن قبل، شادی سے پہلے باغ کے ایک کُنج میں ہو رہی تھی

---

عزیز کالج کا ایک طالب علم تھا اور اپنے والدین کی تنہا اولاد۔ جب وُہ تعلیم سے فارغ ہوا تو باپ نے اُسے اپنے کاروبار میں داخل کر کے دفتر کا

انچارج کر دیا۔

اِسی دفتر میں ایک نوجوان لڑکی نسیمہ بھی کام کرتی تھی۔ جو بہت حسین و سلیقہ مند تھی اور جس سے عزیز کا باپ ایسی محبّت کرتا تھا جیسے وُہ اسی کی لڑکی ہو۔ عزیز و نسیمہ کی یکجائی نے آہستہ آہستہ اُن کے دلوں میں وُہ کیفیّت پیدا کر دی جس کا نام محبّت رکھا جاتا ہے اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دس سال پُورے لُطف و مُسرّت، عیش و راحت سے گزر گئے۔ اور زندگی کی کسی تلخی سے اُنہیں واسطہ نہ پڑا۔ خدا نے ایک بچّی بھی عنایت کی جو بہت پیاری اور خوبصورت تھی اور باوجود صغرسنی کے بہت ہوشیار تھی۔ والدین کی اہلی معیشت اور رُوحانی مسرّت کا تنہا مرکز یہی لڑکی، اور اسی کو دیکھ دیکھ کر دونوں جیتے تھے۔

ہر چند عزیز اپنے والد کی وفات کے بعد بہت بڑی دولت و جائداد کا مالک ہو گیا تھا۔ لیکن نسیمہ خود ہی گھر کا سارا کام انجام دیتی تھی اور کسی خادمہ کو اُس نے نہ رکھا تھا۔ لیکن جب دس سال تک مسلسل کام کرنے کے بعد اُس کے قویٰ میں کچھ اضمحلال پیدا ہُوا تو مجبوراً ایک خادمہ بھی اُس نے رکھ لی جس کا نام صبیحہ تھا۔

بد قسمتی سے یہ خادمہ نوجوان بھی تھی اور حسین بھی۔ دوسری طرف عزیز فطرتاً کمزور ارادہ کا، جذبات سے مغلوب ہو جانے والا انسان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز اس کی طرف مائل ہونے لگا۔ اور غریب نسیمہ کو کچھ تو اس اعتماد کی بنا پر جو اپنے شوہر پر تھا اور کچھ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کی وجہ سے اس طرف مطلق توجہ نہ ہوئی۔

ایک دن نسیمہ گھر کے لئے ضروری اشیاء خریدنے بازار گئی اور عزیز کو تنہا گھر میں چھوڑ گئی۔ یہ پہلی تنہا فرصت تھی جو عزیز اور خادمہ کو میسر آئی۔ لڑکی اپنی ماں کے واپسی سے قبل مدرسہ سے لوٹی تو سیدھی باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ دیکھا کہ عزیز خادمہ کو آغوش میں لئے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے کہ "صبیحہ اس میں شک نہیں کہ تُو فرشتہ ہے فرشتہ۔"

غریب لڑکی کچھ نہ سمجھ سکی کہ اس فقرہ کا کیا مطلب تھا۔ اس لئے جب نسیمہ بازار سے واپس آئی تو اُس نے پُوچھا کہ "اے ماں! مدرسہ میں مجھ کو بتایا گیا ہے کہ فرشتے اُڑتے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے"؟

نسیمہ۔ "ہاں بیٹی فرشتے اُڑتے ہیں جبھی تو وہ کبھی آسمان پر نظر آتے ہیں کبھی زمین پر۔"

بیٹی۔ "اگر ایسا ہے تو پھر ہم صبیحہ کو کبھی اُڑتے ہُوئے کیوں نہیں دیکھتے؟"

ماں یہ سُنکر ہنسنے لگی اور بولی کہ "کیا تمہاری اُستانی نے تم کو بتایا ہے کہ صبیحہ اُڑ سکتی ہے"؟

بیٹی۔ "لیکن صبیحہ تو فرشتہ ہے اِس لئے اُسے اُڑنا چاہیئے۔"

نسیمہ۔ "تم سے کس نے کہا کہ وُہ فرشتہ ہے؛ وُہ تو ہماری تمہاری طرح ایک انسان ہے"۔

بیٹی۔ "میں نے ابّا جان کو یہ کہتے سُنا تھا وُہ اس کو گود میں لئے بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تُو فرشتہ ہے"۔ یہ سُن کر نسیمہ کی وُہ کیفیّت ہوئی جیسے دفعۃً بجلی گر پڑے۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر آہستہ آہستہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

---

دوسرے دن جب لڑکی مدرسہ سے واپس آئی تو دیکھا کہ ماں بستر پر بیمار پڑی ہوئی ہے اور خادمہ موجود نہیں ہے۔ اس نے پُوچھا کہ "صُبیحہ کہاں گئی"۔ ماں نے جواب دیا کہ "اے بیٹی وُہ فرشتہ تھی اس لئے اُڑ گئی"۔ یہ ہے واقعہ اُس فرشتہ کا جو عزیز و نسیمہ کے امن و سکون کو چُرا کر جُرم و معصیت کی فضا میں اُڑ

کر چلا گیا۔

اس کے بعد عزیز دنسبرہ میں پھر کبھی اتحاد پیدا نہیں ہوا۔ اور ان کی تمام مسرتیں ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گئیں۔ یہاں تک کہ اُن کی بیٹی بھی آخر کار بیمار پڑی اور مر گئی۔

(نگار مئی ۱۹۳۲ء)

# قطرۂ آتشیں

گزشتہ قرن کے آخر میں سرزمینِ ہنگری نے دو بھائی کارولی کسوالڈی اور الگزنڈر ایسے پیدا کیے، جن پر وہاں کے ادبیات کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے، کارولی ہر چند خصوصیات کے ساتھ اپنی روایات تمثیلی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، لیکن اس نے اپنی مختصر زندگی میں جو ہمیشہ خطرات سے گھری رہی ــــ بعض ایسے عجیب و غریب فسانے بھی لکھے" جن پر ہنگاری ادب جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔

آج کی صحبت میں اسی کے ایک افسانہ کا ترجمہ (جسے میں نے عربی سے لیا ہے) درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ جب ایک ماہر افسانہ نویس کسی

ہاتھ بندھا ہُوا تھا، اور گلے میں رُومال ڈال کر اس پر اسے سہارا دے کر لٹکا لیا تھا، اور باوجودیکہ وُہ حد درجہ صبر و ضبط سے کام سے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی بے چین کراہ کبھی کبھی نکل ہی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے نہایت ہی عزّت و احترام سے اس کا استقبال کیا اور بولا کہ تشریف رکھئے اور فرمایئے کہ مَیں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہُوں"۔

"ایک ہفتہ سے میرے ہاتھ میں اس قدر شدید درد ہے کہ ایک لمحہ کیلئے بھی پلک نہیں جھپکا سکا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ درد سرطان کی وجہ سے ہے یا اور کسی بیماری کی وجہ سے، پہلے ہلکا ہلکا قابلِ برداشت تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ اس کی برداشت ممکن ہی نہیں، پھر بھی نہیں بلکہ وُہ ہر ساعت بڑھتا جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ کرب و ایذا کا عذاب بھی مجھے ہلاک کئے ڈالتا ہے۔ اس لئے خدا کیلئے کوئی تدبیر کیجئے۔ میرا ہاتھ کاٹ ڈالیئے، آگ سے داغ دیجیے۔ بہرحال جو کچھ کرنا ہو جلد کیجیے۔ ورنہ مَیں پاگل ہو جاؤں گا اگر جان نہ نکلی"۔

ڈاکٹر نے اسے تسکین دی اور کہا کہ "یہ مرض ایسا سخت نہیں ہے اور

ایک واقعہ میں مرکزیّت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ کس قدر اہتمام کرتا ہے اور کس طرح ماحول کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اس مرکز میں جذب کر دیتا ہے، جسے اس نے ہدفِ خیال بنایا تھا۔ مصنّف نے اس قصّہ کا عنوان "پوشیدہ زخم" رکھا تھا۔ مَیں نے اسے "قطرۂ آتشیں" سے بدل دیا ہے۔

(نیاز فتحپوری)

---

ایک دن طلوعِ آفتاب سے قبل، بہت سویرے ایک شخص ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس آیا اس حال میں کہ وُہ ابھی تک بیدار نہ ہُوا تھا۔ دروازہ پر پہنچکر اُس نے ڈاکٹر صاحب کے خادم سے التجا کی کہ "اپنے آقا کو جگا دو۔ کیونکہ مَیں نہایت ہی سخت مرض لے کر آیا ہوں اور اس پر اسی وقت عملِ جرّاحی ہونا چاہیئے"

جب ڈاکٹر جاگا اور اس کو ایسی شدید ضرورت کا علم ہُوا تو اس نے فوراً کپڑے پہنے اور خادم کو حکم دیا کہ آنے والے کو اندر بھیجدے۔

نو وارد کے خدو خال وضع ولباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وُہ بہت بلند طبقہ سے تعلّق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے چہرہ کی زردی اعصاب کے ہیجان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو کوئی شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہے، اس کا داہنا

جرّاحی کی ضرورت نہ ہوگی آپ مطمئن رہیں۔"

"نہیں نہیں جرّاحی کی ضرورت یقیناً ہوگی اور میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے تاکہ اس عذاب سے نجات مل جائے یہ کہتے ہوئے اُس نے رومال سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور اس کو اُٹھا کر بولا' آپ کو غالباً یہ دیکھ کر تعجّب ہوگا کہ ہاتھ میں بظاہر کوئی زخم یا درد کا سبب موجود نہیں ہے' مگر میرا مرض ہی قیاس سے باہر ہے' مگر اپنی نوعیّت کے لحاظ سے بالکل عجیب و غریب ہے۔

ڈاکٹر نے نہایت غور سے اِس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس میں کوئی علامت کسی مرض کی نہ تھی اور بائیں ہاتھ کی طرح وہ بھی بالکل صحیح تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ "درد کس جگہ محسوس ہوتا ہے"؟ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھایا اور دونوں وریدوں کے درمیان اُنگلی کے اشارہ سے ایک جگہ کو متعیّن کیا۔ ڈاکٹر نے حد درجہ نرمی سے اس کو چھوا لیکن وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور درد کی شدّت سے چیخ اُٹھا۔

ڈاکٹر نے کہا "سخت حیرت ہے مجھے آپ کے ہاتھ میں کسی مرض کا ہونا معلوم نہیں ہوتا۔"

"لیکن درد سے تڑپ رہا ہوں۔

ڈاکٹر نے خوردبین اُٹھا کر اس سے اس کے ہاتھ کا نہایت غور سے معائنہ کیا۔ تھرما میٹر سے اس کا درجہ حرارت دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا کہ جلد اور شرائین بہترین حالت میں ہیں۔ ورم والتہاب کا کوئی نشان نہیں ہے اور ہاتھ ہر مرض سے پاک ہے"۔

"لیکن اس حصّہ میں جہاں درد ہے سُرخی تو معلوم ہوتی ہے"۔

"کہاں ہے"؟

اس نے ایک گول چھوٹا سا دائرہ اُنگلی سے بناتے ہوئے کہا۔"اس جگہ"۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس شخص کو اگر کوئی بیماری ہے تو عقل کی خرابی کی ہے۔ اس لئے اس نے کچھ تامّل کرکے جواب دیا کہ آپ کچھ دن شہر میں قیام کریں مَیں علاج میں پُوری کوشش صرف کردونگا"۔

مَیں تو ایک لمحہ کا انتظار نہیں کرسکتا، آپ مجھے دیوانہ سمجھئے اور نشتر نکال کر اتنا حصّہ گوشت کا اور جی چاہے تو ہڈی بھی نکال کر پھینک دیجئے"۔

"میں تو یہ نہیں کرسکتا"۔

"کیوں"؟

"اس لئے کہ آپ کا ہاتھ میری طرح صحیح و سالم ہے اور اس میں جرّاحی کی ضرورت نہیں"۔

یہ سُن کر اس آدمی نے اپنی جیب سے ہزار روپیہ کا نوٹ نکالا اور سامنے میز پر رکھ کر بولا کہ آپ مجھے شاید دیوانہ سمجھتے ہیں، لیکن میں کامل صحتِ عقل کی حالت میں ہُوں آپ عملِ جرّاحی کے لئے آمادہ ہوں تو یہ حقیر ہدیہ پیش کرنے کیلئے تیاّر ہوُں"

"میں عضوِ صحیح میں نشتر کا استعمال نہیں کر سکتا خواہ دولتِ قارون ہی کیوں نہ ملے"۔

"کیوں"؟

"اس لئے کہ یہ میرے ضمیر اور میرے پیشے کے آداب کے خلاف ہے"۔

"اچھاّ تو پھر میں ہی عمل جرّاحی کر لوں گا، ہر چند میرا بایاں ہاتھ اچھّی طرح کام نہ دیگا، لیکن آپ یہ تو کریں گے کہ جب میں گوشت کا درد مُنہ حصّہ کاٹ ڈالوں تو زخم کا علاج آپ کریں"۔ یہ کہہ کر اُس نے فوراً آستین چڑھائی اور قبل اس کے کہ ڈاکٹر روکے جیب سے چاقو نکال ہاتھ میں تیرا دیا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہ کہیں کوئی ورید یا شریان نہ کٹ جائے فوراً چیخ کر کہا

کہ ٹھہر جائیے اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں اس عمل کو پورا کئے دیتا ہوں، یہ کہہ کر اُس نے اپنی آستین چڑھائی اور کہا کہ اپنا منہ پھیر لیجئے ۔ اس خیال سے کہ خون بہتا ہوا دیکھ کر متاثر نہ ہوں، لیکن اس نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے دیکھتے رہنا چاہیے تاکہ میں صحیح جگہ آپ کو بتا سکوں"۔

ڈاکٹر نے اپنا عمل شروع کیا اور وہ نہایت اطمینان سے بغیر کسی خوف وہراس، یا لرزہ وارتعاش کے اس کو برداشت کرتا رہا، جب ڈاکٹر گوشت کا اتنا حصّہ کاٹ چکا تو مریض نے اطمینان کی سانس لی، ڈاکٹر نے دریافت کیا اب تو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا۔

اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "نہیں لیکن ذراسی ٹیس زخم کی ہے، اب تو خون کو آزادی کے ساتھ بہہ جانے دیجئے تاکہ پھر خلش باقی نہ رہے۔

ڈاکٹر نے زخم پر پٹّی باندھی اور مریض نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ہوٹل کا پتہ بتا کر واپس گیا۔ ڈاکٹر روز وہاں جاتا اور پٹّی بدل کر چلا آتا، چند دن میں زخم بالکل اچّھا ہوگیا اور پھر وُہ اپنے وطن چلا گیا۔

(۲)

گزشتہ واقعات کو تین ہفتہ کا زمانہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر واپس آیا اس

حال میں کہ اس کا ہاتھ پھر رومال میں لٹکا ہُوا تھا اور اسی مقام پر کرب و الم کی وہی شکایت اس کی زبان پر تھی، اس کا چہرہ زرد تھا اور سرد پسینہ اس کی پیشانی پر ٹپک رہا تھا، کرسی پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے بڑھایا، اور بولا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کافی گہرائی تک چاقو پہنچا کر عمل جرّاحی نہیں کی اور اسی لئے درد پھر عود کر آیا اور اسی شدّت کے ساتھ، مہربانی فرما کر پھر عملِ جرّاحی کیجیے لیکن مکمّل طور پر۔"

ڈاکٹر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کے پہلے عمل جراحی کیا تھا.....

پھر کوئی علامت موجود نہ تھی، نئی جلد پیدا ہو کر تمام وریدیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں، نبض بھی اعتدال کے ساتھ چل رہی تھی، تپ کی بھی کوئی علامت نہ تھی، لیکن وہ شخص درد کی وجہ سے کانپا جا رہا تھا، ڈاکٹر نے مجبوراً پھر شگاف دیا اور پھر اس کا درد دُور ہو گیا، لیکن جب وہ جانے لگا تو ایک حزن و ملال کے ساتھ بولا کہ تعجّب نہ کرنا اگر مَیں پھر ایک مہینہ کے بعد آؤں، ڈاکٹر نے کہا کہ آپ یہ خیال دل سے نکال ڈالیے، اللہ نے چاہا تو اب مرض کا اعادہ نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ مجھے تو اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسے خدا کے وجود کا، لیکن خیر دیکھا جائے گا۔

جب وُہ چلا گیا تو ڈاکٹر نے اس واقعہ کا ذکر اپنے اور ہم پیشہ احباب سے بھی کیا۔ لیکن کوئی تشخیص نہ کر سکا۔

(۳)

ایک مہینہ گزر گیا اور وُہ شخص واپس نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی ہفتے گزر گئے، یہاں تک کہ ڈاکٹر اس واقعہ کو بھول گیا۔ ایک دن اتفاق سے اس کا ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا:۔

میرے عزیز دوست!

مَیں آپ کو زیادہ عرصہ تک حیرت میں مُبتلا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہتا ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ درد نے پھر تیسری مرتبہ عود کیا اور مَیں نے نہایت تیز دہکتا ہُوا انگارہ رکھ دیا۔ اب میں اس قابل ہُوا ہُوں کہ ہاتھ کو حرکت دے سکوں اور یہ خط آپ کو لکھتا ہوں۔

کچھ زمانہ ہُوا کہ مَیں اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی، کیونکہ نشاطِ زندگی کے لئے جتنے اسباب کی ضرورت

ہے وُہ سب مہیّا تھے، مَیں نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو حُسن و جمال، سلیقہ و تہذیب کے لحاظ سے عدیم المثال تھی، یہاں مجھے بتا دینا چاہیے کہ شادی سے قبل میری بیوی کی دوست ایک اور خاتون بھی تھی جو نہایت ذی عزّت اور دولتمند بھی تھی

شادی کے چھ مہینے جس لُطف و مسّرت سے بسر ہوتے اس کا بیان محال ہے، ہر نیا دن گویا خلوص محبّت کا ایک نیا دروازہ تھا اور زندگی کا ہر لمحہ ولولہ و شوق کی پُرلطف داستان، جب مَیں کسی ضرورت سے شہر جاتا تو واپسی کے وقت وُہ دور تک پیدل چل کر میرا خیر مقدم کرتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وُہ میری رُوح کے ساتھ جی رہی ہے۔

اسی لُطف و مسّرت کی زندگی میں دفعتہً یہ خطرہ میرے دل میں پیدا ہوا اور خدا جانے کیوں، کہ اس کی تمام باتیں تکلّف و تصنع ہیں، میری بیوی کے پاس، ایک سینے پرونے کی میز تھی اور اس میز میں ایک خانہ تھا جس کو وُہ ہمیشہ مقفّل رکھتی، نہایت احتیاط سے اس کو بند کرتی اور کُنجی اپنے پاس رکھ لیتی، اس بات سے میرے

دل میں شکوک پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان میں اس قدر استحکام پیدا ہو گیا کہ مجھے اس کی تمام محبّت جھوٹی اور جملہ عنایتیں مکرو فریب نظر آنے لگیں، مَیں بیتاب تھا کہ کسی طرح اس خانہ کو کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر کیا ہے جس کی وہ اس قدر اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی ہے۔

ایک دن وہی خاتون جو میری بیوی کی دوست تھی آئی اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ مجھ سے بھی اصرار کیا لیکن مَیں نے کہا بعد دوپہر آؤنگا، ان کے جانے کے بعد مَیں فوراً میز کے قریب گیا اور کسی نہ کسی طرح اس خانہ کو کھولا جو مقفّل رہتا تھا، اس کے اندر منجملہ اور اشیا کے ایک بنڈل بنفشی رنگ کے ڈورے سے بندھا ہوا ملا، میرا دل دیکھتے ہی دھڑکا تھا، لیکن جب مَیں نے اسے کھولا تو میرا شک یقین سے بدل گیا۔ کیونکہ یہ عشقیہ خطوط کا بنڈل تھا، مَیں نے ایک ایک کر کے انہیں پڑھا اور اب مَیں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا لکھا تھا اور کس طرح انہیں پڑھ رہا تھا، یہ میرے ایک دوست کے خطوط تھے اور اس زمانہ کے تھے جبکہ میری شادی ہو

چکی تھی۔ میں نے مہر خانہ کے اندر ان کو رکھا اور قفل لگا دیا۔

جب شام کو میری بیوی واپس آئی تو حسبِ عادت اسی شوق و ولولہ کے ساتھ ملی جو روز اس سے ظاہر ہوتے تھے۔ میں نے ضبط سے کام لیا اور اس پر اپنے تأثر کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا، کھانے کے بعد حسبِ معمول کچھ وقت باتوں میں صرف کیا اور پھر اپنے اپنے کمرہ میں آرام کی غرض سے چلے گئے۔ میں اس وقت بالکل دیوانہ تھا، دماغ کی یہ حالت تھی جیسے کوئی سیسہ پگھلا کر اندر ڈال رہا ہے۔

جب آدھی رات ہوئی تو میں اُٹھا اور دبے قدموں اس کی مسہری تک پہنچا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور اس کے چہرہ سے پورا اطمینان و سکون ظاہر تھا، اس کے چہرہ کے اس سکون کو دیکھ کر میری دیوانگی میں اور اضافہ ہوا اور میں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی، یہ میری گرفت ایسی آہنی گرفت تھی کہ ایک مرتبہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھ تو لیا، لیکن اس

نے نہ کوئی آواز نکالی نہ ہاتھ پاؤں مارے معلوم ہوتا تھا کہ وُہ بہت سکون کے ساتھ اس موت کو برداشت کر رہی ہے تھوڑی دیر میں اس کا دم نکل گیا، اور کوئی علامت ایسی ظاہر نہ ہوسکی جس سے کسی کو قتل کا شبہ ہوسکتا البتہ جب گلا دبانے سے اس کا مُنہ زیادہ کھلا تو اس سے خون کا ایک قطرہ نکل کر میرے داہنے ہاتھ کے اس حصّہ پر گر پڑا جس سے آپ خوب واقف ہیں لیکن اس کا علم بھی مجھے صبح کو ہوا۔

دوسرے دن جب اسے دفن کر کے گھر واپس آیا تو وہی خاتون (جو میری بیوی کی دوست تھی) گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور کلماتِ تعزیت استعمال کرنے کے بعد بولی کہ میں اس وقت ایک خاص غرض سے آئی ہوں اُمید ہے کہ آپ میری مدد کرینگے۔ میں نے کہا فرمایئے، اس نے جواب دیا کہ آپ کی بیوی کے پاس میرے کچھ خطوط امانتاً جمع تھے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وُہ کہاں ہیں اور کیا آپ مجھے واپس دیں گے؟ میں نہیں بیان کرونگا کہ یہ سُن کر میرا کیا حال

ہوا۔ اگر وُہ خاتون سامنے نہ ہوتی تو شاید میں چاقو سے اپنے دل کو نکال کر پھینک دیتا، دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دیتا، بہرحال میں نے حد درجہ صبر و ضبط سے کام لیا اور خطوط کا وُہ بنڈل نکال کر میں نے خاتون کے حوالہ کیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ٹھیک اسی جگہ جہاں قطرۂ خون گرا تھا جلن محسوس ہوئی اور اس میں رفتہ رفتہ وُہ شدّت پیدا ہوئی جس کا علم آپ کو بھی ہے، بہرحال چونکہ وُہ میرے جُرم کی سزا ہے۔ اس لئے میں اسے برداشت کرونگا اور اس کا مداوا نہ چاہونگا، علاوہ اس کے اب یوں بھی کوئی ضرورت اس کے دفع کرنے کی نہ ہوگی۔ کیونکہ میں بہت جلد اس کے پاس پہنچنے والا ہوں ممکن ہے کہ وُہ میرے اس قصور کو معاف کر دے اور ہم دونوں پھر اسی کھوئی ہوئی محبّت کی فضا میں روحانی زندگی بسر کریں"۔

(نگار اپریل ۱۹۲۸ء)

# ایک لاسلکی ڈرامہ

# افراد

**انتظام علی**۔ معاشیات کے پروفیسر، شعر و موسیقی سے بالکل بیگانہ۔ لیکن بیوی سے محبّت کرنے والے۔

**ثریّا بیگم**۔ پروفیسر صاحب کی جدید تعلیم یافتہ بیوی، شاعری کی دلدادہ، گھر کی طرف سے ایک حد تک غافل، لیکن شوہر کی مطیع۔

**گلشن**۔ گھر کی پرانی ضعیف خادمہ۔

**اختر**۔ پروفیسر صاحب کے دوست۔

(۱)

[پروفیسر صاحب مکان کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ (دروازہ کھُلنے کی آواز، پھر پاؤں کی چاپ۔]

انتظام علی۔ گلشن! گلشن!!"

گلشن۔ (دُور کی آواز سے) "حاضر ہوئی حضور"

[نیز قدموں کی آواز]

انتظام علی۔ "کیا تم کچھ کام کر رہی تھیں گلشن"!

ہے۔"

انتظام علی۔ (بلند آواز سے) بیگم، ذرا اِدھر تو آؤ۔"

[دروازہ کھُلنے کی آواز]

ثریا بیگم۔ (غصّہ کے لہجہ میں) کیوں کیا کہتے ہو"؟

انتظام علی "یہ اتنی خفگی گلشن پر کیوں ہو رہی ہے۔ خیریّت تو ہے"؟

ثریا بیگم۔ (تیز غصّہ کی آواز سے) "سالن جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔ خدا جانے پتیلی چڑھاتے چڑھاتے کہاں غائب ہو گئی مردار، اب کیا میں اپنا سر کھانے کو دونگی"۔

انتظام علی۔ (نرم آواز سے) مگر تم تو وہاں موجود تھیں"۔

ثریا بیگم۔ (برہمی کے تیز لہجہ سے) "تھی، تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ہر وقت چولھے میں سر ڈالے بیٹھی رہتی"۔

انتظام علی (نرم مگر طعنہ آمیز لہجہ سے) "مگر بیگم یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے تمہاری شاعری سلامت چاہیئے۔ سالن جلتا ہی رہے گا، روٹیاں جھُلستی ہی رہیں گی۔ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے"۔

گلشن "پتیلی چڑھا رہی تھی میاں"۔

انتظام علی "بیگم کہاں ہیں"؟

گلشن۔ "وہیں باورچی خانہ میں ہیں"۔

انتظام علی "کیا کر رہی ہیں"؟

گلشن "کچھ لکھ رہی ہیں"۔

انتظام علی "اور گنگنا بھی رہی ہیں"؟

گلشن۔ (دبی زبان سے رُک رُک کر) "ہاں۔ میاں۔ کبھی کبھی -- گنگنانے بھی لگتی ہیں"۔

انتظام علی "شعر کہہ رہی ہونگی۔ وہ تو میں جانتا ہوں کہ ہمیشہ کام ہی کے وقت ان پر شاعری کا دورہ پڑتا ہے، خیر، ذرا خیال رکھنا، اختر صاحب بھی کھانا یہیں ——"

(دُور سے "گلشن! گلشن" کی آواز سنائی دیتی ہے اور گلشن تیز قدموں کے ساتھ واپس جاتی ہے)

وہی آواز "کمبخت، مر گئی جا کر، جب دیکھو کام ہی کے وقت غائب ہوتی

**ثریّا بیگم۔** (بگڑ کر) مَیں پوچھتی ہوں کہ تمہیں میرے لکھنے پڑھنے سے کیوں بیر ہے۔ تم اگر چاہتے ہو کہ میں ہر وقت تمہاری طرح اس فکر میں مُبتلا رہوں کہ غلّہ کا کیا نرخ ہے۔ کپڑے کا کیا بھاؤ ہے۔ کتنا سونا ہندوستان سے باہر جا رہا ہے۔ کتنی شکر جاوا سے ہندوستان آرہی ہے۔ تو مَیں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مَیں تمہارے کام میں حارج نہیں تو تمہیں کیوں میرا مشغلہ بُرا معلوم ہو، خوب!

{باہر سے ”گلشن، گلشن کی آواز آتی ہے۔}

**انتظام علی۔** (آہستگی سے لیکن غصّہ کے انداز میں) اختر آگئے ہیں۔ مَیں باہر جاتا ہُوں۔ کھانا بازار سے آجائے گا۔ آپ جایئے شعر کہیے۔“

{قدموں کی چاپ اور پھر دروازہ کھُل کر بند ہونے کی کرخت آواز۔}

**اختر۔** ”خیریت تو ہے۔ اس وقت اندر کیا کر رہے تھے“؟

انتظام علی۔ (مایوسی کے لہجہ میں) "کر کیا خاک رہا تھا۔ اب تو تمہاری بھابی کی شاعری میری برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے"۔

اختر۔ (ہنس کر) "شاعری کرتی ہیں تو کرنے دو، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے"؟

انتظام علی۔ "ہونہہ، تمہیں کیا خبر کہ ان کا ایک ایک شعر میرے لئے کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے۔ آج ہی اُنہوں نے ایک شعر کہا، لیکن اُس وقت جب گوشت جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ پرسوں بھی خیر سے ایک شعر فرمایا تھا لیکن جب بلّی سارا دُودھ پی چکی۔ کل ہی کی بات ہے کہ بندر ان کے پاس سے میری شیروانی اُٹھا کر لے گیا، اُدھر جب وُہ تار تار ہو چکی تو اِدھر شعر پُورا ہوا۔ میَں کہتا ہُوں کہ اگر یہ مشقِ سخن چند دن اور جاری رہی تو دیوان پُورا ہونے سے پہلے ہی یہاں دیوالہ نہ نکل جائے"۔

اختر۔ (قہقہہ لگاتے ہُوئے) "بھئی، بُرا نہ مانو تو کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ کچھ قصور تمہارا بھی ہے"۔

انتظام علی۔ "میرا، میرا کیا قصور ہے"؟

اختر۔ "یہی کہ تم ان کے ذوق کا خیال نہیں رکھتے، اگر کبھی کبھی تم بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لے لیا کرو تو کیا حرج ہے"۔

انتظام علی "عجیب باتیں کرتے ہو۔ مجھے جب ایک چیز سے لگاؤ ہی نہیں تو کیا خاک دلچسپی لے سکتا ہوں"۔

اختر۔ "تاہم محض ان کی دلدہی کے لئے اگر مصنوعی طور پر اس کا اظہار ہو تو کیا نقصان ہے"۔

انتظام علی۔ (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) "بہتر ہے یہ بھی کر دیکھوں گا"۔

## (۲)

[ایک ہفتہ کے بعد۔ ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں انتظام علی ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ (چھالیہ کترنے کی آواز اور پھر قدموں کی چاپ۔]

انتظام علی "۔ بیگم! تمہارے لئے ایک عجیب چیز لایا ہوں۔ یہ لو جرمنی کا

چھپا ہُوا دیوانِ غالب۔ دیکھو کتنا خوشنما ہے"۔

[(تھوڑے وقفہ کے بعد) ورق اُلٹنے کی آواز]

ثریّا بیگم۔ "بیشک بہت خوبصورت ہے"۔

انتظام علی۔ "غالب واقعی اچّھا شاعر تھا"؟

ثریّا بیگم۔ "ہو گا مجھے کیا معلوم"۔

انتظام علی۔ "ہو گا؟ اِس کے کیا معنی۔ کیا تمہیں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی"؟

ثریّا بیگم "۔ جی نہیں"۔

انتظام علی"۔ اور یہ جو دو گھنٹے سر کھپا کر مَیں نے غزل کہی ہے۔ اُسے کون سُنے گا"؟

ثریّا بیگم۔ (ہنستے ہُوئے) "آپ اور غزل۔ کیا کہنا"۔

انتظام علی۔ "ہاں، تم مذاق سمجھتی ہو، لو، سنو، ہر چند یہ میری پہلی کوشش ہے۔ لیکن مَیں سمجھتا ہُوں کہ ناکامیاب نہیں رہا۔ پہلا شعر۔ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا؟ اچّھا تو مطلع سنو:۔

ہم نہیں وُہ جنہیں آتا ہے پریشان ہونا
مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیران ہونا

ثریّا بیگم۔ "سبحان اللہ، کیا کہنا"

انتظام علی۔ "اچھّا دوسرا شعر سنو اسی سلسلہ کا ہے۔

کفِ افسوس کا ملنا کِسے کہتے ہیں جناب
نام کِس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

ثریّا بیگم۔ "تو یُوں کہئے کہ آپ نے "نظم مسلسل" تحریر فرمائی ہے"۔

انتظام علی۔ "اسے نظمِ مسلسل کہتے ہیں؟ اچھّا تو آج یہی سُن لو۔ کل غزل بھی سُن لینا۔ تیسرا شعر اس میں میرا نام بھی ہے:۔

کیوں وہاں تم گئے بیکار اے انتظامؔ
کس نے تم سے کہا وہاں جاکر پابجولاں ہونا

[ثریا بیگم کے قہقہہ کی آواز]

انتظام علی۔ "کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے"؟

ثریّا بیگم۔ "آپ کا مقطع تو تقطیع سے بالکل گر گیا"۔

انتظام علی۔ "تقطیع سے گِر گیا؟ گِر جانے دو اس میں حرج ہی کیا ہے بس

دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی۔ شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور تم نے ہر مرتبہ دیگچی گرا کر کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔"

ثریّا بیگم۔ "پھر تم نے وہی طعن و تشنیع کی باتیں شروع کر دیں۔"

انتظام علی۔ (نرمی سے) بگڑو نہیں، دیکھو اب میں شعر کہنے لگا ہوں — اور ہاں بیگم یہ جو غالب نے لکھا ہے:۔

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

اس کا کیا مطلب ہے؟"

ثریّا بیگم۔ "میں بھلا آپ ایسے قابل شخص کو کیا سمجھا سکتی ہوں۔ آپ کیوں مجھے بناتے ہیں۔"

انتظام علی۔ "شعر کو قابلیّت سے کیا واسطہ۔ یہ بھی کوئی ریاضی کا مسئلہ ہے علم الکیمیا کا نظریہ ہے جس کے سمجھنے میں قابلیّت کی ضرورت ہو۔ چند الفاظ خاص ترتیب سے جمع کر دیئے اور کوئی مہمل سی بات کہہ دی شعر ہو گیا۔"

ثریّا بیگم۔ "بجا ہے، شعر کی یہ تعریف مجھے آج ہی معلوم ہوتی۔ میں تو سنا

کرتی تھی کہ شعر فنونِ لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص شاعری کر سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے خاص دماغ لے کر آیا ہو اور ــــــــ"

انتظام علی۔ (بات کاٹ کر) شعر فنونِ لطیفہ میں داخل ہو یا فنونِ کثیفہ میں۔ اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ زمانہ کی حالت تو یہ ہے کہ پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی میسّر آجائیں تو جانیئے کہ بڑی دولت ہاتھ آگئی۔ اور اُدھر جیب دیکھیے دامن کا چاک گریباں کے چاک سے ملا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان دھجیّوں کو کوئی کہاں تک رفو کرے گا اور ایسی فضول خرچی کی تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہو گا؟"

ثریّا بیگم "ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینی چاہیئے۔"

انتظام علی "خیر جانے دو۔ یہ تو پھر جھگڑے کی بات شروع ہو گئی یہ تو بتاؤ کہ میں نے غزل کیسی کہی؟"

ثریا بیگم "کیا کہنا جواب نہیں ہے۔"

انتظام علی۔ "اچھّا تو اب روز دو غزلیں مجھ سے لے لیا کرو۔ اب تو نہیں

شکایت نہ ہوگی کہ مجھے شاعری سے لگاؤ نہیں" (پاؤں کی چاپ)

"کیوں کہاں جارہی ہو"۔

**ثریّا بیگم**۔ "کہیں جارہی ہوں۔ آپ کو کیا۔ آپ تو کپڑے پہنئے، کالج جانے کا وقت قریب ہے"۔

{کرسی سرکانے کی آواز۔ تخت کی چرچراہٹ}

## (۳)

{شام کا وقت۔ زنانخانہ کے برآمدہ میں ثریّا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی تلاوتِ قرآن میں مصروف ہے — تلاوت کی آواز لیکن بہت دھیمی۔ اسی دوران میں دروازہ کھلنے، کسی کے چلنے اور پھر کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی ہے۔}

**انتظام علی**۔ "ہائیں، ابھی تک فارغ ہی نہیں ہوئیں، کیا آج پورا

کلام مجید ختم کرنے کا ارادہ ہے"۔

["ہونہہ" کی آواز اور پھر تلاوتِ کلام مجید]

انتظام علی "۔اجی مُنہ سے بولو، یہ وظیفہ کبھی ختم بھی ہو گا یا نہیں۔ مجھے غزلیں سُنانا ہیں۔ عشق و عاشقی کی باتیں کرنا ہیں اور آپ خدا سے لَو لگائے بیٹھی ہیں"۔

{تلاوت کی آواز برابر آرہی ہے
کچھ وقفہ کے بعد}

انتظام علی "۔اچھا تم تلاوت کیے جاؤ، میں بھی غزلیں سُناتا ہوں"۔

ثریّا بیگم۔(غصّہ کی آواز سے) "لاحول ولا، ناک میں دم ہے۔ اس گھر میں نماز روزہ بھی دشوار ہو گیا ہے"۔

انتظام علی۔(نرمی سے) "مَیں پوچھتا ہُوں کہ یہ جو دَورہ آپ پر پڑا ہے۔ کبھی ختم بھی ہو گا یا نہیں"؟

ثریا بیگم۔(بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کیا کوئی بیماری ہے جس کا دَورہ پڑتا ہے، خوب، آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے"۔

انتظام علی "۔ مذہب کے ساتھ کون بُرا سلوک کر سکتا ہے۔ نماز روزہ میرا ایمان ہے، لیکن میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تو تم نے کبھی بھول کر بھی سجدہ نہ کیا تھا۔ اب جو اس کا خیال آیا تو کیوں؟ اور وہ بھی اس شدّت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی تیمّم کا تودہ بنی بیٹھی ہیں"۔

ثریّا بیگم "۔ چلو، ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھّی نہیں معلوم ہوتیں، اللہ رسول کے ساتھ مجھے مذاق پسند نہیں"۔

انتظام علی "۔ مذاق، مذاق کیسا؟ میں تمہیں نماز پڑھنے سے نہیں روکتا۔ تلاوت سے باز نہیں رکھتا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کو یاد نہ کیا۔ اور اب جو عبادت پر آئیں تو اس شان سے کہ گھر کو مسجد بنا کے رکھ دیا"۔

ثریّا بیگم "۔ خیر، ہو گا، کسی کو کیا؟ میں نماز نہیں پڑھتی تھی تو خدا کا گناہ کرتی تھی اور اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے پڑھتی ہوں۔ آپ کا اس میں کیا نیچ ہے"؟

انتظام علی ۔"میرا پیچ یہ ہے کہ جس دن سے تم نے نماز شروع کی ہے صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ سنانے کا موقع ملے تو اور کہوں، مجھے تو اس مہینے میں پورا دیوان ختم کرنا ہے۔ آخر یہ کام کیونکر چلے گا؟"

ثریّا بیگم ۔"آپ غزلیں کہے جائیے، مجھے سنانے کی ضرورت ہی کیا ہے"؟

انتظام علی ۔"اور تم برابر اسی طرح رات دن نماز پڑھتی جاؤ گی، مانو گی نہیں"۔

ثریّا بیگم ۔"نہیں مانونگی"۔

انتظام علی ۔"بہتر ہے"۔

[کرسی سرکانے اور چلنے کی آواز]

(۴)

{ مرغ کے بولنے کی آواز۔ اِدھر اُدھر چلتے ہوئے قدموں کی چاپ }

ثریّا بیگم ۔ (بلند آواز سے) "گلشن، گلشن"

گلشن۔ (دور سے) ”حاضر ہوئی بیوی“۔

[گلشن کے قدموں کی آواز]

ثریا بیگم۔ ”میرا مصلا کیا ہوا“؟

گلشن۔ ”بیوی، مجھے کیا خبر، آپ نے جہاں رکھا ہو گا، وہیں ہو گا“۔

ثریا بیگم۔ (بگڑ کر تیز آواز میں) ”سوائے چوکی کے اور کہاں رکھتی ہوں۔ یہیں جانماز تھی۔ یہیں کلام مجید تھا، اسی جگہ دلائل الخیرات تھی۔ یہیں تسبیح تھی، رحل تھی اور اب کسی ایک چیز کا پتہ نہیں“۔

گلشن۔ ”بیوی، بندر لے گیا ہو گا“۔

ثریا بیگم۔ (طعن آمیز لہجہ میں) ”اور مصلے پر بیٹھا ہوا کلام مجید بھی پڑھ رہا ہو گا نامعقول کہیں کی، جا ڈھونڈھ کے لا، وقت جا رہا ہے“۔

گلشن۔ ”بیوی، میں کہاں دیکھوں، میں نے کہیں رکھا ہوتا تو لا کر دے دیتی“۔

{دروازہ کھلنے کی آواز اور
قدموں کی آہٹ}

انتظام علی۔ ”بیگم، گلشن پر کیوں خفا ہو رہی ہو۔ مجھ سے پوچھو۔ لو، یہ ہے تمہارا تمام عاشور خانہ میری بغل میں۔ مگر خدا کے لئے یہ تو بتا دو کہ

یہ چلّہ کتنے دنوں کا ہے۔ تاکہ مَیں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں۔"

[ثریا بیگم کی ہنسی کی آواز]

ثریّا بیگم۔ "خفا تو نہ ہوگے اگر سچ سچ کہہ دوں۔"

انتظام علی۔ "یہ لو تمہاری جانماز، تسبیح اور قرآن سب اپنے سر پر رکھ کر کہتا ہوں کہ خفا نہ ہونگا۔"

ثریّا بیگم۔ "اچھّا تو وعدہ کیجئے کہ آئندہ آپ کبھی کوئی شعر نہ کہیں گے۔"

انتظام علی۔ (سنجیدگی سے) کیوں کیا تمہیں میری شاعری سے تکلیف ہوتی ہے۔"

ثریّا بیگم۔ "تکلیف! یہ نہیں کہتے کہ کلیجہ پیپ ہو کر رہ گیا ہے۔"

انتظام علی۔ "تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو۔ مَیں نے تو صرف تمہاری خوشی کے لئے شاعری شروع کی تھی۔ تم پسند نہیں کرتیں تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضائع کروں۔"

ثریّا بیگم۔ "ہاں، میری خوشی ہو چکی اب میری مرضی یہی ہے کہ آپ اس سے

توبہ کرلیں۔"

انتظام علی۔ "اچھّا میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن تم بھی توبہ کرو کہ —"

ثریّا بیگم۔ "خدا تمہیں شرمائے، نماز سے توبہ کراتے ہو جس نے تم سے شاعری کی لت چھڑوائی۔"

انتظام علی۔ "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو جس نے تمہیں نماز کی عادت ڈلوائی۔"

[دونوں کا قہقہہ]

(نگار اپریل ۱۹۳۷ء)

مختاراتِ نیاز